اسلامی بنیاد پرستی کا
ابھار

تاریخ، حقائق اور تجزیہ

297.1977
40 ا
96200

جدوجہد پبلیکیشنز

اسلامی بنیاد پرستی کا ابھار

تاریخ ، حقائق اور تجزیہ

جدوجہد پبلیکیشنز

[illegible]

297.1977
40
94200

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب : اسلامی بنیاد پرستی کا ابھار

تاریخ اشاعت : جولائی 2004ء

طابع : شناخت پریس لاہور

ٹائٹل ڈیزائننگ : میاں عبدالجبار

کمپوزنگ : نوید شاہد

پبلشرز : جدوجہد پبلیکیشنز

قیمت : 50 روپے

تقسیم کار

جدوجہد پبلیکیشنز (رجسٹرڈ)

40۔ایبٹ روڈ لاہور فون: 042-6315162

فہرست

● اسلامی بنیاد پرستی کا سیاسی ابھار	فاروق سلہریا	6
● مصر سے پاکستان براستہ ایران	فاروق سلہریا	11
● اسلامی بنیاد پرستی آگے بڑھتی ہے	فاروق سلہریا	16
● ایران! بنیاد پرستی فاتح ہوتی ہے	فاروق سلہریا	23
● اسلامی بنیاد پرستی! سامراج مخالف نہیں	فاروق سلہریا	26
● منشیات کے ذریعے ''جہاد''	فاروق سلہریا	31
● مذہبی جنونیت! متحدہ مجلس عمل		
مقبولیت کا گھوڑا کب بدلے گا؟	فاروق طارق	37
● انتہا پسندوں کے الفاد اعمل میں تضاد	رضوان عطا	45
● مذہبی سیاسی جماعتوں کا فروغ!		
فرقہ واریت کو فروغ دینے کی زرخیز زمین	فاروق طارق	48

● اسلامی نظام کے نعرے، ملائیت اور فرقہ واریت کا آغاز	زاہد چوہدری	52
● ملا اسٹیبلشمنٹ اتحاد: بغل میں چھری.........منہ میں رام رام	فاروق طارق	57
● فرقہ واریت کی مختصر تاریخ	خشونت سنگھ	62
● بھارتیا جنتا پارٹی: ووٹ لینے کے لئے بنیاد پرستی پھیلاتی ہے	سری لتا سوامی ناتھن	66
● ملاء ملٹری الائنس: جمہوریت کم آمریت زیادہ ہوگئی	فاروق طارق	70
● ہم چار، ہمارے بارہ...... آر ایس ایس کا پراپیگنڈا ۔ ڈاکٹر کملا حسن	ارشد علی فخر	77
● اسلامی بنیاد پرستی: طارق علی کی نظر میں	فاروق سلہریا	80
● مودودی، جماعت اسلامی اور دوغلا پن	شاہد محمود	87
● قبائلی علاقوں میں فوج کشی مذہبی جنونیت کو جڑ سے نہیں اکھاڑ سکتی	فاروق طارق	91
● عورتوں کی نمائندگی: مذہبی و سیاسی جماعتوں کا ردِ عمل	سلمان عابد	97
● وانا آپریشن: غلط اندازے، بھاری نقصان	فاروق طارق	102
● بھارتی انتخابات: واجپائی کی امن پسندی؟ نہیں! انتخابات کے لئے موقع پرستی	فاروق طارق	110
● جاوید انجم چل بسا: ملاؤں نے زبردستی مسلمان کرنا چاہا	جدوجہد رپورٹ	125

اسلامی بنیاد پرستی کا سیاسی ابھار

فاروق سلہریا (جنوری2004ء)

اسلامی بنیاد پرستی ایک ایسا مظہر ہے جو اپنی جڑیں، معاشرے کی قدامت پسندی، معاشرتی محرومیوں، شعور کے معیار کے فقدان، غُربت اور جہالت میں تلاش کرتا ہے۔ فسطائیت اور قومی انا پسندی کی طرح اسلامی بنیاد پرستی، کم مایہ متوسط طبقہ میں اپنی راہیں تلاش کرتا ہے۔ لیکنِ یہ بے حقیقت شہری متوسط طبقہ ہی نہیں جو اسلامی بنیاد پرستی کی طرف راغب ہوتا ہے بلکہ یہ تحریک اُنکو بھی متاثر کرتی ہے جو متوسط طبقہ سے عوام کی سطح یا نیم عوامی سطح پر گرِ چکا ہو۔ اِسی طرح، عوامی سطح کے ایسے طبقے جو نئے وجود میں آئے ہوں اور ابھی طبقاتی شعور سے آگاہی اور طبقاتی جدوجہد کا تجربہ نہ رکھتے ہوں، اِس تحریک کا حامی بننے کا امکان رکھتے ہیں۔

یہ ممکن ہے کہ اسلامی بنیاد پرستی کے عروُج کی تین عمومی وجوہات کی تفریق ہو سکے۔

1۔ سامراجیت سے تضاد

جب عربوں نے دوسرے ملکوں پر چڑھائی کی تو کافروں کے خلاف جہاد کے نام پر ''مقدس'' جنگ کی۔ اگرچہ ان جنگوں کے معاشی مُحرک تھے۔ اُنیسویں اور بیسویں صدی میں، جب مسلمان مُمالک، ایک دوسرے کے بعد، سامراجی ملکوں کی نوآبادیاں بننے لگے، تو مزاحمتی تحریکوں نے مذہب اور قومیت کو آزادی کی جدوجہد کی مہم کے آغاز کے لیے استعمال کیا۔ انڈونیشیا اور ملائیشیا جیسے مما لک میں قومی آزادی کی تحریک مذہب کے نام پر شروع کی گئیں۔

حال ہی میں، جیسے ہی کثیر الاقوامی کمپنیوں نے عالمِ اسلام کے انتہائی استحصال میں

مزید اضافہ کیا ہے، بہت سے قدرتی ردعمل میں سے ایک انکے ہیڈ کوارٹرز (یعنی مغرب) سے نفرت کرنا ہے۔ سرد جنگ کے دوران، سامراج نے اسلامی بنیاد پرستوں کو بائیں بازو کے خلاف استعمال کیا۔ بنیاد پرست جماعتیں، مسلم ممالک میں سامراج کی قریبی رفیق تھیں۔ تاہم، بعداز سرد جنگ دور میں سامراج کو اُنکی اُس طرح سے ضرورت نہیں رہی جس طرح ماضی میں تھی۔ سی آئی اے نے اسلامی بنیاد پرستوں کو مالی امداد دینا بند کر دی۔ اس بدلتی صورتحال نے اسلامی رجعت پسندوں کو سامراج کے متضاد لا کھڑا کیا۔ اسکے ساتھ ہی، صدیوں کے نوآبادیاتی نظام اور استحصال کے تجربہ کی وجہ سے، عالمِ اسلام میں، جیسے کسی بھی تیسری دنیا کے ملک میں، مغرب کے خلاف، خصوصی طور پر امریکہ کے خلاف، وسیع پیمانے پر نفرت پھیل گئی ہے۔

بعداز سرد جنگ دور کی بدلتی صورتحال میں، بنیاد پرست سامراج مخالف نعرے بازی کی طرف مُڑ گئے اور سامراج کے خلاف ابھر کر طاقت کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ اُسامہ بن لادن سامراج کے خلاف ایک علامت بن گیا، خواہ وہ کسی بھی طبقہ سے تعلق رکھتا ہو یا وہ کسی بھی طرح کے حربے استعمال کرتا ہو، بنیاد پرستی کے دہشت گردی کے طریقوں کو، بنیاد پرستوں کی صفوں میں اِسے امریکہ کے خلاف جہاد کے طور پر لیا گیا، جبکہ عمومی طور پر تحریک کو امریکہ کے خلاف للکار کے طور پر لیا گیا۔

2۔ بُنیادی مسائل کے حل کے لیے سرمایہ داری کی معذوری

اسلامی بنیاد پرستی، اُن ممالک میں تیزی سے پھیل رہی ہے جہاں سرمایہ داری نظام غُربت اور جہالت ختم کرنے میں ناکام ہوا ہے اور جہاں طبقاتی کشمکش تیز ہوتی جا رہی ہیں۔ غُربت اور جہالت لازم وملزوم ہیں۔ جہالت سے بھرپور معاشرہ، بنیاد پرستی کے خیالات کے لیے زرخیز زمین ہے۔

دوسری طرف، بنیاد پرستوں نے، مسلم ممالک میں جہاں اُنکی طاقت ہے، معاشرتی خدمات کے اپنے مہیب جال کے ذریعہ متبادل معاشرے قائم کر لئے ہیں۔ وہ ہسپتال، سکول، یتیم

خانے اور بہت سی دوسری خدمات مہیا کرتے ہیں، جو کمزور سرمایہ دار حکومتیں عوام کو مہیا کرنے میں ناکام ہوگئی ہیں۔ یہ اُن کے، بطور معاشرتی طاقت کے، اثر میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ اُن کے سکول (مدرسے) انتہائی موثر ہتھیار ہیں۔ یہ مدرسے اُن غریب والدین، جو تعلیم اور کھانا دینے کی استطاعت نہیں رکھتے، کے بچوں کو نہ صرف مذہبی تعلیم مہیا کرتے ہیں بلکہ طعام وقیام کی بھی ضمانت دیتے ہیں۔

آیئے! پاکستان میں تعلیم کے شعبے میں صورتحال دیکھیں۔ 40 فیصد آبادی غربت کی لکیر کے نیچے زندگی گزار رہی ہے۔ 1980ء میں یہ شرح 20 فیصد تھی۔ پاکستان اپنے سالانہ بجٹ کا 40 فیصد دفاع پر خرچ کرتا ہے۔ جبکہ مزید 40 فیصد آئی ایم ایف اور عالمی بنک کے قرضے چکانے کے نام پر خرچ ہو جاتا ہے۔ مشکل سے ایک فیصد تعلیم پر خرچ ہوتا ہے۔ سرکاری اعداد وشمار کے مُطابق، خواندگی کی شرح 30 فیصد ہے جس پر شاید ہی کوئی یقین کرے۔ تقریباً 60 فیصد بچوں کو سکول جانے کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ تعلیم کی نجکاری نے کارکنوں کے لئے اپنے بچوں کو سکول بھیجنا مزید مشکل کر دیا ہے۔

اب آیئے! اِسکا بنیاد پرستوں کے زیرِ اہتمام چلنے والے تعلیمی نیٹ ورک سے موازنہ کریں۔

وزارتِ داخلہ کی مئی 2003ء کی جاری کردہ ایک رپورٹ کے مطابق، تقریباً 6870 مدرسے موجود ہیں۔ 1947ء میں پاکستان کے قیام کے وقت 247 مدرسے تھے۔ اسکا مطلب ہے کہ 28 گنا اضافہ ہوا ہے۔ اِن مدرسوں میں 1.5 ملین (15 لاکھ) بچے داخل ہیں۔ اس کے مقابلے میں ایک رپورٹ کے مطابق مقابلتاً 1.9 ملین (19 لاکھ) بچے سرکاری پرائمری سکولوں میں داخل ہوتے ہیں۔ مگر اوپر دیئے ہوئے اعداد وشمار کچھ گمراہ کن ہیں۔ اِس امر کی حقیقت یہ ہے کہ یہ رپورٹ صرف رجسٹرڈ مدرسوں کا ذکر کرتی ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق تقریباً 20 ہزار سے زیادہ غیر رجسٹرڈ مدرسے موجود ہیں۔ ایک اخباری اطلاع کے مطابق،

مدرسوں کی تعداد تیس ہزار ہے، جن میں 3 لاکھ اساتذہ ملازم ہیں۔

اِسی طرح، حماس اور اِسلامی جہاد محض خودکش حملہ آور ہی اسرائیل نہیں بھیجتے۔ بنیاد پرست جماعتیں فلسطین میں، سکول اور ہسپتال بھی چلا رہی ہیں اور کھانا اور ادویات فراہم کر رہی ہیں۔ سہولتیں فراہم کرنے کا یہ 'جال' جو بنیادی طور پر ریاست کی ذمہ داری ہے، بنیاد پرستوں کو عوام میں اپنی جڑیں گہری کرنے میں مدد دیتا ہے۔

بائیں بازو کی ناکامی

یہ ایران تھا جہاں اسلامی بنیاد پرستوں کو پہلی بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ تودہ پارٹی (ایرانی کیمونسٹ پارٹی) دیوالیہ سٹالینی "مرحلہ وار نظریہ" کے تحت انقلاب میں یقین رکھتی تھی۔ عوامی بنیاد ہونے کے باوجود، تودہ پارٹی نے اپنے نظریات کی مُطابقت سے، بجائے عوام کو ایک متبادل فراہم کرنے کے، بنیاد پرستوں کے ساتھ الحاق کر لیا۔ یہی نہیں، بلکہ ایرانی بائیں بازو کی جماعتیں بھی شاہ کے خلاف جمہوری تحریکوں میں اپنے آپ کو متبادل کے طور پر پیش کرنے میں ناکام رہیں اور سرمایہ داری کا تختہ اُلٹنے اور اسے سوشلزم سے بدلنے کے لیے، طبقاتی جدوجہد کو جمہوری تحریکوں کے ساتھ منسلک کرنے میں ناکام رہیں یا کوشش نہیں کی۔ بنیاد پرستوں کے ساتھ گٹھ جوڑ مہلک ثابت ہوا۔ بنیاد پرست اقتدار میں آنے پر کیمونسٹوں کا صفایا کرنے کے راستے پر چل پڑے اور کامیاب ہو گئے۔ سوشلسٹ انقلاب کا ایک سنہرا موقعہ ضائع کر دیا گیا اور محنت کش طبقہ کو ایک بھاری قیمت چُکانا پڑی جو وہ اب تک چکا رہے ہیں۔

افغانستان دوسرا مُلک تھا جہاں بنیاد پرستوں کو اقتدار پر قبضہ کرنے کا موقع ملا۔ افغانستان میں، بنیاد پرست اقتدار میں ایک "سوشلسٹ" حکومت کے براہِ راست خاتمے کے بعد آئے۔ افغان انقلابیوں نے، جنہوں نے اقتدار پر قبضہ کیا تھا، ماسکو کے سکھائے ہوئے سٹالینی احکامات اور طریقِ کار کے سامنے ہتھیار پھینک دیئے، انقلاب کو جمانے کے لیے، بجائے بین الاقوامیت کو رجوع کرنے کی کسی حقیقی کوشش کے، کارکنوں کی جمہوریت مضبوط کرنے کے اور

انقلاب کو طول دینے کے لیے مادی بنیادیں وضع کرنے کے، اُنہوں نے ایک بدلتی ریاست کو چلانے کے لیے، سٹالینی افسر شاہی اور طبقاتی گٹھ جوڑ اور مصالحت کے طریقِ کار کو اپنایا۔ نتیجہ کے طور پر وہ ناکام ہوئے اور بنیاد پرستوں کے لیے راہ ہموار کر دی۔

اِسی طرح الجزائر میں جہاں سوشلسٹوں نے کامیابی سے فرانس کے خلاف قومی آزادی کی تحریکوں کی قیادت کی اور دو دھائیوں سے زیادہ اقتدار میں رہے، وہ اسلامی بنیاد پرستی کو اُبھرنے سے روکنے میں ناکام رہے۔ الجزائر میں بنیاد پرستوں کی تحریک عالمِ اسلام میں آج کے دور کی سب سے زیادہ طاقتور تحریک ہے۔

دوسری طرف، مسلم بھائی چارہ جسکے 1940ء میں صرف 500 ارکان تھے اور جو 1950ء تک بڑھ کر نصف ملین ارکان کی جماعت بن چکی تھی، تیزی سے اپنی کشش اور اساس کھو بیٹھی جب جمال عبدالناصر کی قیادت میں تختہ اُلٹ دیا گیا۔

اگلے ابواب میں اِنکے مقدموں کا مطالعہ مزید وضاحت کرے گا۔

☆☆☆

مصر سے پاکستان براستہ ایران

فاروق سلہریا (جنوری 2004ء)

مصر، ایران اور پاکستان، اسلامی بنیاد پرستی کے اضافے کا مطالعہ کرنے کے لحاظ سے دلچسپ مقدمے بنتے ہیں۔ مصر کئی لحاظ سے پہلا اسلامی ملک تھا جسے ایک اسلامی بنیاد پرستی کی تحریک کے اضافے کا تجربہ ہوا اور وہ تحریک ''اسلامی بھائی چارہ'' ابھی تک زندہ ہے، پھل پھول رہی ہے اور تمام عالمِ اِسلام میں اپنا اثر رکھتی ہے۔ ایران پہلا مُلک تھا جہاں بنیاد پرست اقتدار پر قابض ہو سکے، جبکہ پاکستان، ایک اہم مسلم ملک، اُبھرتی ہوئی اسلامی بنیاد پرستی کی گرفت میں ہے۔ اِن ممالک میں اُبھرتی ہوئی بنیاد پرست تحریکوں کا تجزیہ کرتے ہوئے، کئی باتوں کے علاوہ، ایک بات نظر آئے گی:

۱۔ بنیاد پرست منافق رہے ہیں، محنت کش طبقہ کے خلاف، اور جن ادوار میں بائیں بازو کی تحریکیں مضبوط تھیں تو سامراجیت کے حمایتی۔

۲۔ سامراج مُخالف بائیں بازو یا متبادل اِنتہا پسند (radical) قومی تحریک کی غیر موجودگی میں بنیاد پرستوں کا قابلِ ذکر اضافہ نظر آیا۔

۳۔ بنیاد پرست اپنا اصل ایجنڈا چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔

مذہب سیاست میں

فرانس کی فوجوں نے 1797ء میں مصر فتح کر لیا تھا تاہم برطانیہ نے فرانس کو ہاتھ کھینچنے پر مجبور کر دیا اور آخر کار مصر برطانیہ کی نو آبادی بن گیا۔ مُحمد علی کے زیرِ حکومت، جو ایک

البانوی تھا، مصر میں کچھ جدیدیت آئی۔ 1820ءویں میں مصر کپاس برآمد کر رہا تھا اور تیزی سے اُبھرتے ہوئے شہروں میں صنعتیں لگ رہی تھیں۔ مصر کو پہلا مسلم آبادی کا ملک کہا جاتا ہے جہاں جدید محنت کش طبقہ اُبھرتے دیکھا گیا۔ اِس کے نتیجہ میں برطانوی سامراج کے خلاف قومی جدوجہد کا مزاج بھی سیکولر تھا۔ صعد زغلُل کی قیادت میں ''وفد پارٹی'' نے درمیانہ طبقہ کی نُمائندگی کی۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران مصر میں دو اہم واقعات ہوئے۔ ایک طرف تو مصریوں نے کپاس کی تجارت سے بہت منافع کمایا کیونکہ جنگ کے باعث مغربی درآمدات سُست ہو گئیں تھیں۔ اِس بات نے اُن کے اعتماد میں اضافہ کیا اور اُنہوں نے برطانوی نوآبادکاروں سے کسی حد تک آزادی کا مطالبہ کیا۔

دوسری طرف، 1917ءتک، مصر ہڑتالوں کی بہت بڑی لہر کا سامنا کر رہا تھا۔ نتیجتاً، ''وفد پارٹی'' 1924ءتک اقتدار میں آ چکی تھی۔ زغلُل جو پہلے جمال الدین افغانی کے اتحاد المسلمین سے متاثر تھا، کو اپنے آپ کو اسلامی نظریہ سے دور کرنا پڑا۔ تاہم وفد پارٹی اور برائے نام آزادی نے مصری عوام کی غلط فہمی کو دُور کر دیا کیونکہ ''وفد'' کی حکومت محنت کش طبقے کی تحریک کو دبا رہی تھی۔ محنت کش طبقہ نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ ''وفد'' کی حکومت مغربی اثر سے اپنے آپ کو آزاد نہیں کر پائی۔

مصر کے انتشار سے مایوس ہو کر ایک سکول کے استاد حسن البنیٰ نے ''مسلمان بھائی چارہ'' (Muslim Brotherhood) کی بنیاد رکھی۔ وہ افغانی نظریات سے متاثر تھا۔ اس کی تحریک غیر معمولی رفتار سے بڑھی۔ ''مسلمان بھائی چارہ'' جس کے 1932ء میں 15 یونٹ تھے، 1940ء میں ان کی تعداد پورے ملک میں 500 ہو گئی۔ 1940ء کے دوران یہ یقین کیا جاتا تھا کہ ''مسلمان بھائی چارہ'' کے ممبران کی تعداد 5 لاکھ تھی اور اتنی ہی تعداد میں اس کے ہمدرد تھے۔ اس وقت عرب دنیا کی یہ سب سے بڑی سیاسی جماعت تھی۔ ''مسلمان بھائی چارہ'' کی کامیابی کی وجہ واضح تھی: یہ وفد پارٹی کے خلاف تھی جسے اس وقت سامراج مخالف اور

قومی آزادی کی تحریک کی رہنمائی کرنے والی جماعت سمجھا جاتا تھا۔ دوسری وہ ''وفد'' سے متضاد تھی، ''مسلمان بھائی چارہ'' اپنے نعروں کی حد تک سامراج مخالف تھی۔

حسن البنّا صرف سرمایہ داری پر تنقید کے ساتھ، مغرب مُخالف ہی نہیں تھا بلکہ وہ بے حد کیمونزم مُخالف بھی تھا۔ اِسکے ساتھ ساتھ ''مُسلم بھائی چارے'' نے مصری یہودیوں اور عیسائیوں کو ''داخلی دُشمن'' قرار دے دیا تھا۔ 1930ء کے دوران، مُسلم بھائی چارہ ٹریڈ یونین تحریک میں اپنا اثر رسوخ قائم کرنے کے لیے بائیں بازو کے ساتھ مُقابلہ کر رہا تھا۔ بعد میں، سرد جنگ کے دوران، کیمونزم سے نفرت، ''مُسلم بھائی چارہ'' کو امریکی سامراج کے نزدیکی رابطوں میں لے آئی۔

جولائی 1952ء میں، جمال عبدالناصر اور ''آزاد افسران'' (Free Officers) نے مصر میں اقتدار سنبھال لیا۔ اگلے 20 سالوں تک اُنکے نظریات کو عرب دُنیا پر برتری حاصل رہی۔ زرعی اصلاحات، صنعتی عمل، عرب سوشلزم کے نعروں وغیرہ نے ناصر کو وسیع حمایت عطا کی۔ 1956ء میں جب ناصر کا برطانیہ اور فرانس سے نہر سویز کے قومیانے پر اِختلاف ہوا تو وہ عرب دُنیا کی حمایت پر جیت سکا بہ نسبت مُسلم دُنیا کی حمایت کی وجہ سے۔ یہ وہ وقت تھا جب ''مُسلم بھائی چارہ'' اپنی کشش کھو بیٹھا تھا اور عوامی تنظیم نہ رہا تھا۔ مزید یہ کہ ''آزاد افسران'' کی حکومت نے کیمونسٹوں کے ساتھ ساتھ ''مُسلم بھائی چارہ'' پر بھی پابندی لگا دی۔ 1960ء کے وسط تک معیشت بُرے حال میں آ گئی اور ایک عوامی بے اِطمینانی پھیل گئی۔ اگرچہ 1967ء میں ناصر نے اسرائیل کے خلاف جنگ میں حمایت اکٹھی کر لی تھی اور 1970ء میں اپنی وفات تک اِقتدار میں رہ سکا۔ تاہم، وسیع پیمانے پر ناصری تصورات کے بارے میں مایوسی پھیل گئی۔

کیمونسٹ اِس دوران کوئی متبادل پیش کرنے میں ناکام ہو گئے۔ کیمونسٹ جو شروع میں ''وفد'' نے کُچل دیئے تھے 1940ء میں دوبارہ سر اُٹھانے کے قابل ہو گئے۔ ''مُسلم بھائی چارہ'' میں ترقی بھی اُس دور سے مُطابقت رکھتی ہے جب کیمونسٹ منظر سے اوجھل ہو گئے تھے۔

تاہم 1940ء کے آخر میں، کیمونسٹ تصورات طلبا، مزدوروں اور نو جوانوں میں مقبول ہونا شروع ہو گئے تھے۔ تاہم، سٹالینی نظریات کی رُکاوٹ، اُنکی ترقی میں بہت بڑی رُکاوٹ ثابت ہوئی۔ کیمونسٹ، قومی مصری متوسط طبقے کا انتظار کر رہے تھے کہ وہ اپنا کردار ادا کریں جب ''آزاد افسران'' سامنے آئے۔ ایک مصری کیمونسٹ لیڈر ''ہنری کوریل'' کے الفاظ میں ''عوام اب بھی ہماری تقلید کرنے کو تیار ہیں مگر ہمیں اب نہیں علم کہ اُنہیں کس راہ پر لے کر جائیں؟'' جب ''آزاد افسران'' نے اقتدار سنبھالا تو، بڑا کیمونسٹ گروپ، ڈی ایم این ایل (DMNL) آزاد افسران کی حمایت کر رہا تھا، جبکہ دو دوسرے گروپ دی فلیگ (ال۔رایا) اور ''ورکرز ویینگارڈ'' اِس حکومت کو، ماسکو افسر شاہی کی ہدایات کے مُطابق، ''قومی فسطائی'' (National Fascists) قرار دے رہے تھے۔ ''آزاد افسران'' کی چھ ماہ کی حکومت کے بعد، جب کیمونسٹوں کو دباؤ کا سامنا کرنا پڑا ڈی ایم این ایل نے بھی اپنی راہ بدل لی۔

1955ء میں مُتحدہ مصری کیمونسٹ پارٹی تشکیل دی گئی مگر اب ناصر بھی ماسکو کے ساتھ ایک اتحاد میں شامل ہو چُکا تھا اور یو ای سی پی نے ایک قلابازی کھاتے ہوئے اعلان کیا کہ ''مصری معاشرہ گہری تبدیلیوں سے گزر کر آیا ہے۔ ایک تابع نیم جاگیرداری معاشرہ ہونے کے بعد اب آج یہ ایک آزاد اور جمہوری معاشرہ ہے۔''

اس نے مزید اعلان کیا ''ہم اپنے تمام تر خلوص اور طاقت کے ساتھ ناصر کی حکومت کی امن اور آزادی کی پالیسیوں کی حمایت کرتے ہیں اور سامراجی سازشوں کے خلاف اسکی پالیسیوں کا دفاع کرتے ہیں''۔ پارٹی نے اپنے قیدیوں کو بھی ایک خط لکھا کہ ''ہم ایک مُقتدر پارٹی ہیں''۔ 1964ء میں پارٹی نے ناصر کی حکومت کے ساتھ ایک مُعاہدہ کیا کہ یہ خود کو ''عرب سوشلسٹ یونین'' میں مدغم کر لے گی اِس شرط پر اسکے ارکان کو جیل سے رہائی دی جائے۔ 30 سال کے بعد مصر میں کوئی کیمونسٹ پارٹی وجود نہیں رکھتی تھی۔

یہ وہ وقت تھا جب مصر میں ایک نیا محنت کش طبقہ اور طلبا کی سرگرمیوں کی ایک نئی لہر

دیکھنے میں آرہی تھی۔ 1960ء میں مصر میں طلبا کے جامعات میں انتہا پسندی دیکھنے میں آئی۔ مگر منظر سے بایاں بازو غائب تھا۔

ناصر کی وفات کے بعد، انور سادات نے اقتدار سنبھالا اور مصر کو دوبارہ سامراجی نظریات کے زیرِ اثر لے آیا۔ سادات نے بنیاد پرستوں کو محدود آزادی کی اِجازت دے دی۔ (اس معاشقے نے بعد میں 1981ء میں اُس کی جان لے لی)۔ سادات نے نجکاری کا عمل شروع کر دیا جو جا کر وسیع بے چینی پر منتج ہوا۔ 1977ء میں، مصر وسیع ہڑتالوں کی گرفت میں تھا۔ سادات، خوراک کے حوالے سے فسادات، جس نے سادات کی حکومت کو تین دن کے لیے بے اثر کر دیا تھا، کُچلنے کے لیے وحشیانہ دباؤ پر اُتر آیا۔ نئی کیمونسٹ پارٹی جو جلاوطنی میں تشکیل دی گئی، ان ہڑتالوں میں کوئی کردار ادا کرنے کے لئے بہت کمزور تھی، جو عرب دُنیا میں اب تک کی سب سے بڑی تھیں۔

بنیاد پرستوں کے لیے ایک مرتبہ پھر سیاسی میدان کُھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ آج بھی، مصر میں، بنیاد پرست ہی اصل مُخالف طاقت شمار ہوتے ہیں۔

☆☆☆

بنیاد پرستی آگے بڑھتی ہے

فاروق سلہریا (جنوری2004ء)

1946ء کا سال سامراجی برطانوی حاکموں کے لیے مہلک ثابت ہوا۔ بھارت بغاوت پر اُترا ہوا تھا۔ ریلوے، ڈاک کے عملے، پولیس سے لے کر بحری عملے تک، ہر کوئی ہڑتال پر تھا۔ سامراج کے فرمانبردار گاندھی سے لے کر کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا (CPI) تک کوئی بھی اس زور پکڑتے ہوئے طوفان کو ٹھنڈا نہیں کر پا رہا تھا۔ 1925ء میں بننے والی کیمونسٹ پارٹی نے اپنے آپ کو اس انقلابی دور سے الگ رکھا ہوا تھا کیونکہ وہ ماسکو سے ہدایات پر عمل کرتے ہوئے برطانوی سامراج کی ساتھی تھی۔ ماسکو کا لندن سے ہٹلر کے خلاف اتحاد تھا۔ لہذا، سی پی آئی نے برطانوی سامراج کی کھُلم کھلا حمایت کی۔ مجاہدین آزادی کو سی پی آئی نے ''ففتھ کالمسٹ'' قرار دیا۔ سی پی آئی جس نے محنت کش طبقہ میں مضبوط بنیادیں قائم کی تھیں اور جو تیزی سے گاندھی کی کانگریس کا ایک متبادل بنتی جا رہی تھی، دوسری جنگِ عظیم میں عوام سے بُری طرح الگ تھلگ رہی۔ اس لئے کانگریس کے لیے ایک خلاء چھوڑ گئی۔

سی پی آئی نے تقسیم کی حمایت کی۔ تاہم اسے ایک مہنگی قیمت چکانا پڑی۔ بھارت کو خون میں نہلا دیا گیا۔ ہندو، مُسلم اور سِکھ مُسلم فسادات دس لاکھ سے زیادہ لاشیں چھوڑ گئے اور تاریخ نے پہلی مرتبہ مُہیب ہجرت کا نظارہ کیا جسے آج کل نسلی صفائی کا نام دیا جاتا ہے۔

مذہبی جماعتیں برطانیہ کے خلاف قومی آزادی کی جدوجہد کے دوران پاکستان کی تخلیق کے خلاف تھیں۔ ان میں سے بیشتر کانگریس کی حامی تھیں۔ انڈین مسلمانوں کی بڑی جماعت مُسلم

لیگ تھی، جسکی قیادت مُحمد علی جناح کر رہے تھے۔ مُسلم لیگ کی قیادت بھارتی مُسلمانوں کے لئے الگ وطن کا مطالبہ کر رہی تھی مگر اِس کی قیادت کو بنیاد پرستوں نے ''غیر مُسلم'' قرار دے دیا تھا، اِس بنا پر کہ مُسلم لیگ کی قیادت ''باعمل مُسلمان'' نہیں تھی۔ جناح خاص طور پر اپنے شاہانہ طرزِ زندگی کی وجہ سے مشہور تھے۔ اُنکی بیٹی نے ایک پارسی مرد سے شادی کی اور خود انہوں نے بھی ایک پارسی لڑکی سے شادی کی۔ بنیاد پرست جماعتیں مُسلم لیگ سے بھارتی مُسلمانوں کے مسئلہ پر مُسلم لیگ سے الگ ہوگئی تھیں جبکہ ہندو بنیاد پرست کانگریس گاندھی اور نہرو قیادت کی وجہ سے، ہندوؤں سے الگ ہوگئے تھے۔

مذہبی جماعتوں نے پاکستان بننے کے بعد قلابازی کھائی اور اپنے آپ کو تحریکِ پاکستان کا سب سے بڑا چمپئین پیش کرنا شروع کر دیا۔ محنت کش طبقے کی ایک مضبوط تحریک کی عدم موجودگی میں اور پاکستان کی سیاست میں امریکہ کے مضبوط اثر کے باعث پاکستان میں جمہوریت کبھی بھی اپنی جڑیں مضبوط نہ کر سکی۔ زیادہ تر فوج ہی ملک پر براہِ راست حکومت کر رہی تھی۔ اسلامی جماعتیں فوجی آمروں کے لئے بی۔ ٹیم کا کردار ادا کر رہی تھیں۔ 1960ء کے آخر میں پاکستانی محنت کش طبقے کی جدوجہد میں تیزی پاکستان پیپلز پارٹی (PPP) کی تشکیل کا باعث بنی۔ پی پی پی جاگیرداری کے خاتمے، صنعتوں کے قومیانے اور سوشلزم کی آواز اُٹھا رہی تھی۔ اسلامی جماعتوں نے جاگیرداری کو اسلامی اقدار کے مُطابق اور پی پی پی کے پروگرام کو غیر اسلامی قرار دے دیا۔ بنیاد پرست الگ رہ گئے تھے۔ 1970ء کے پہلے عام انتخابات نے ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں پی پی پی کو واضح اکثریت عطاء کی جبکہ بنیاد پرست 5 فیصد ووٹ بھی حاصل نہ کر سکے۔ بھٹو نے اقتدار میں آنے کے بعد مزدور طبقہ کی حمایتی اصلاحات متعارف کروائیں اور وسیع پیمانے پر صنعتوں کو قومیانا شروع کر دیا۔ 1980ء کے دوران بنیاد پرست پاکستانی سیاست میں کنارے پر لگا دیے گئے۔ اُن کو سی آئی اے کے ایجنٹ اور رجعت پسند کے طور پر دیکھا جاتا تھا اور وہ سماجی لطیفوں کا عام موضوع تھے۔

1977ء میں امریکہ کی حمایت سے فوجیوں نے جنرل ضیاء کی قیادت میں بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور 1979ء میں بھٹو کو قتل کے ایک جعلی مقدمے میں پھانسی پر لٹکا دیا۔

1980ء کی شروعات افغان جنگ کی صورت میں اسلامی بنیاد پرستی کے فروغ کے لیے نہایت اہم ثابت ہوئیں۔ سعودی عرب، کچھ خلیجی ریاستیں اور امریکہ بمعہ امریکہ کے حامیوں نے کروڑوں ڈالر پاکستان کو مدرسے قائم کرنے اور افغان مُجاہدوں کی بھرتی کے لیے دیئے تاکہ وہ افغانستان جا سکیں۔ ان مدرسوں کے نتیجے میں طالبان باہر نکلے۔ تاہم 1980ء میں، جب پی پی پی ضیاء کی آمریت کے خلاف جمہوریت کی بھرپور تحریک کی قیادت کر رہی تھی تو بنیاد پرست ضیاء کی کابینہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔

1988ء کے عام انتخابات سے جہاں ضیاء ایک طیارے کے حادثہ میں مارا گیا بنیاد پرست کوئی اچھے نتائج حاصل نہ کر سکے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان انتخابات میں پی پی پی فاتح بن کر اُبھری کیونکہ یہ ابھی تک مزدور طبقہ کی جماعت سمجھی جاتی تھی۔ بھٹو کی بیٹی بے نظیر اب اس کی قیادت کر رہی تھی۔ بنیاد پرستوں نے بے نظیر بھٹو کے خلاف ایک بڑی مُہم یہ کہہ کر چلا دی کہ ایک عورت کسی ''مسلمان ریاست'' کی سربراہ نہیں ہو سکتی۔ عوام نے یہ پروپیگنڈا مسترد کر دیا اور بے نظیر کسی ''مسلم ریاست'' کی پہلی سربراہ بن گئی۔

سوویت یونین کا انہدام اور افغان جنگ کے اختتام نے پورا منظر نامہ ہی تبدیل کر دیا۔ پُرانے دوست، بنیاد پرست اور امریکی سامراج، دشمنوں میں تبدیل ہو رہے تھے۔ اب بنیاد پرست پاکستان میں جاگیرداری کا خاتمہ، نجکاری کی مُخالفت اور جمہوریت کی بحالی وغیرہ کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ضیاء کی آمریت کے بعد کی جمہوری حکومتوں نے نیولبرل پالیسیاں اپناتے ہوئے مکمل طور پر آئی ایم ایف اور عالمی بینک کے مطالبات کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ نتیجتاً پاکستان میں عوام کے لیے مزید مصائب اور غُربت ہو گئی۔

بدعُنوانی اِن حکومتوں کے ماتھے سہرا رہی۔ بطور وزیراعظم بے نظیر بھٹو کے ساتھ پی پی

پی دومرتبہ (90-1988ءاور 1996ء۔1993ء) برسرِ اقتدار آئی مگر اُس نے مزدور طبقہ کے لیے کوئی کام نہیں کیا۔ اسکی بجائے اُس نے نجکاری کے عمل کو اور آگے بڑھایا اور جو مزید غربت اور بے روزگاری لے کر آیا۔ بے نظیر کا شوہر بطور ''مسٹر ٹین پرسینٹ''(Mr. Ten Percent) مشہور ہوا اس پر تمام حکومتی سودوں میں بطور کِک بیک دس فیصد حصہ ملنے کا الزام تھا۔ بے نظیر کے دوسرے دور حکومت میں، ''ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل'' (Transparency International) نے پاکستان کو دنیا کا دوسرا انتہائی بدعنوان ملک قرار دیا۔ خوش مزاج پاکستانی کہا کرتے تھے کہ ہماری حکومت نے پاکستان کو پہلے نمبر پر لانے کے لئے آخر (Transparency International) کو رشوت کیوں نہیں دی؟

جب لوگ بورژوا جماعتوں سے بدزن ہو رہے تھے بنیاد پرست اپنے آپ کو متبادل کے طور پر پیش کرتے ہوئے، ''مسٹر کلین'' (Mr. Clean) کے تصور کے ساتھ سامنے آئے۔

اس دوران پاکستانی بائیں بازو کی جماعتیں منظر سے تقریباً غائب ہو چکی تھیں۔ خیر، پاکستانی بائیں بازو کبھی بھی وسیع عوامی بنیاد حاصل نہ کر سکا تھا۔ 1951ء میں کیمونسٹ جماعت پر کُچھ فوجی افسران سے مِلکر پاکستانی حکومت کا تختہ اُلٹنے کے اعزام میں پابندی لگا دی گئی تھی۔ کیمونسٹ، ٹریڈ یونین اور طلباء کی تحریکوں میں اپنی اساس گہری کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ تاہم پاکستانی بائیں بازو کے لوگ ماسکو نواز اور بیجنگ نواز نظریات کی وجہ سے منقسم رہے۔ یہ انکی ترقی کی راہ میں بڑی رُکاوٹ تھی۔ مگر اِس سے بھی بڑا مسئلہ بائیں بازو کی قومی جمہوری انقلاب اور عوامی جمہوری انقلاب کے متعلق حکمتِ عملی تھی۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں جب بیجنگ نواز بائیں باز و فوجی آمر فیلڈ مارشل ایوب خان کی حمایت کر رہا تھا، اُسکی چین سے دوستی کی پالیسی کی وجہ سے، تو ماسکو نواز بائیں بازو اُسکی مُخالفت کر رہا تھا۔

بعد میں بائیں بازو کا ایک دھڑا، ذوالفقار علی بھٹو کو قومی رجعت پسند متوسط طبقے کا لیڈر قرار دے کر اسکی حمایت کر رہا تھا، تو ایک دوسرا دھڑا اسکی مُخالفت کر رہا تھا۔ بائیں بازو نے کوئی

مُتبادل تیار کرنے کی کوشش نہیں کی۔

سوویٹ یونین کے انہدام کے بعد بائیں بازو کے پُرانے سٹالینی تقریباً غائب ہوگئے۔آج کل کُچھ پُرانے سٹالینی الگ تھلگ گروپس میں موجود ہیں۔مگر لیبر پارٹی پاکستان کی صورت میں کُچھ نئی پیش رفت ہوئی ہے۔تاہم بائیں بازو ایک قومی سطح کے مُتبادل کے طور پر موجود نہیں۔اسکا دائرہ اثر چند ٹریڈ یونینز، کسان تنظیموں اور کُچھ نوجوانوں کے گروپس تک محدود ہے۔

11 ستمبر کے بعد پاکستان میں اسلامی بنیاد پرستی کو بڑے پیمانے پر اُبھرتے ہوئے دیکھا جارہا ہے۔اگر ہم محض انتخابات کے نتائج کو ایک معیار کے طور پر لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ 1970ء کے عام انتخابات میں پاکستان میں بالغ رائے دہی پر مبنی پہلے انتخابات میں بنیاد پرست جماعتوں نے 18 نشستیں جیتیں، لیکن 1977ء میں وہ صرف دو سیٹیں حاصل کر سکے۔1988ء کے عام انتخابات میں اُن کی 18 نشستیں تھیں۔1990ء میں اٹھارہ نشستیں، 1993ء میں قومی اسمبلی کی نو نشستیں۔2002ء میں انہیں انتخابات کی سب سے بڑی جیت ہوئی۔نہ صرف ایم ایم اے (سات بڑ بنیاد پرست جماعتوں کا اتحاد) قومی اسمبلی میں تیسری بڑی پارٹی کے طور پر اُبھری بلکہ ایم ایم اے نے ایک صوبے میں حکومت بھی بنالی ہے۔وفاقی حکومت اور ایک اور صوبے کی حکومت کو اُنکی حمایت پر انحصار کرنا پڑ رہا ہے۔انتخابات کی کامیابی مذہبی بنیاد پرستی کے ابھار کا صرف ایک پہلو ہے۔وہ فوج ٹریڈ یونینز اور طلباء میں ایک بہت بڑا اثر رکھتے ہیں۔سب سے بڑھ کر ان میں سے اکثر پارٹیوں کی جنونی گوریلوں کی فوج ہے۔یہ لاکھوں لوگوں کو متحرک کر سکتے ہیں۔پاکستان میں بنیاد پرستی کے عروج کے کسی حد تک عالمی مظاہر اور اُن عوامل جو پچھلے ابواب میں واضح کئے گئے ہیں سے منسلک ہے مگر کُچھ مقامی عوامل بھی ہیں۔پانچ عوامل کا خلاصہ یہاں بیان کیا گیا ہے۔

1۔پاکستان بننے کے بعد صاحب اقتدار افراد نے ملک کو درست رکھنے اور ملک کو کثیر الاقوامی ریاست کی صورت میں چلانے کے لیے مذہب کو مسلسل بطور ہتھیار استعمال کیا ہے تاکہ چھوٹی

اقوام کے حقوق سے انکار کیا جائے اور غیر متعین حکومتوں کی توجیہہ دی جا سکے۔اس نے ریاست اور مذہب کو یکجا کر دیا ہے۔لہذا پاکستان اگر چہ مکمل مذہبی ریاست نہیں مگر ایک نیم مذہبی ریاست بن چکا ہے۔

2۔صاحب اقتدار نے اپنی حکومتوں کو جائز ثابت کرنے کے لئے یا مقبولیت حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ مذہب کو استعمال کیا۔ غیر منتخب حکومتوں نے مذہب کے لیے یہ دلیل دی کہ اسلام اور مغربی جمہوریت مطابقت نہیں رکھتیں جبکہ نام نہاد منتخب حکومتوں نے مذہب کو مقبولیت حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا، جب کبھی بھی یہ خطرہ میں پڑی۔ یہاں تک کہ 1960ء کی دہائی کے آخر میں بھٹو جیسے ایک مقبول لیڈر کو ''اسلامی سوشلزم'' کی اصطلاح استعمال کرنا پڑی اور جب وہ 1977ء میں ایک تحریک کا سامنا کر رہا تھا تو اُس نے جمعہ کو ہفتہ وار تعطیل کا فیصلہ جاری کر دیا اور اسی طرح کی دیگر ظاہری مذہبی اصلاحات کیں اور حکمرانوں کی کئی دھائیوں سے مذہبی استحصال کے بعد، ایک اُبھرتا ہوا نکتہ نظر یہ ہے کہ اگر مذہب ہی تمام مسئلوں کا حل ہے تو پھر ہمیں ایسے لوگوں کو حکومت سونپنی چاہیے جو مذہب کو انتہائی تسلسل کے ساتھ اپناتے ہیں یعنی بنیاد پرست!

3۔مدارس ہر سال نوجوان بنیاد پرستوں کی ایک بڑی فوج مُہیا کرتے ہیں۔غریب والدین اپنے حالات کی وجہ سے اپنے بچوں کو اِن سکولوں میں بھیجنے کے لیے مجبور ہیں۔اُن کے واحد راستے یا تو اپنے بچوں سے مشقت کروانے بھیجنا ہے یا پھر اپنے بچوں کو ان سکولوں میں بھیجنا ہے جہاں انکو مذہبی تعلیم، روٹی، سر چھپانے کی جگہ اور اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد کم از کم کسی مسجد میں ملازمت تو مل جائے گی۔

4۔پاکستان میں بنیاد پرستی کا اضافہ 1980ء کی دہائی میں شروع ہوا۔ایک طرف فوجی آمریت ضیاء الحق مذہب کو اپنی حکومت کا جواز فراہم کرنے کے لیے استعمال کر رہا تھا اور دوسری طرف پاکستان افغان انقلاب کی مُخالف قوتوں کا پہلا پڑاؤ (Base Camp) بن چکا تھا۔نہ صرف ہزاروں پاکستانی گوریلے پاکستانی سرزمین سے سرگرمِ عمل تھے بلکہ دوسرے ''مُسلم ممالک'' سے

25000 گوریلے براستہ پاکستان افغانستان پہنچ گئے تھے۔

افغان جنگ کے خاتمے پر فوجی حکام نے ان گوریلا قوتوں کو کشمیر میں ایک جنگ لڑنے کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ یہ جاری ہے۔ پاکستانی فوج انہیں صرف کشمیر میں استعمال کرنے میں دلچسپی رکھتی ہے مگر جس طرح سے ان گوریلوں کے ذہنوں کو سدھایا گیا ہے، یہ ممکن نہیں رہا کہ اُن کو صرف کشمیر تک محدود رکھا جائے۔ اُنہیں تمام کفار کے خلاف لڑنا سکھایا گیا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کے لیے مورو (فلپائن) سے چیچنیا پہنچ جاتے ہیں۔ جب اُنکی غیر مُلکی مصروفیات ختم ہوتی ہیں اور وہ واپس گھر لوٹتے ہیں تو وہ ریاست کے لیے ایک بڑا چیلنج بن سکتے ہیں۔ وہ پہلے ہی اپنی طاقت آزما رہے ہیں۔ 1999ء میں اسلام آباد میں امریکہ کے سفارت خانے پر حملہ اور بھارت سے ایک جنگجو لیڈر مولانا مسعود کی رہائی کے مطالبہ پر بھارتی طیارے کا اغوا اُنکی طاقت کا مظہر ہے۔

5۔ پاکستان کی سٹریٹیجک صورتحال بھی بنیاد پرستی کے فروغ کے لیے ایک زرخیز زمین مہیا کرتی ہے۔ دو مسلم ممالک ایران اور افغانستان جنہوں نے اسلامی بنیاد پرست حکومتوں کا مزہ چکھا ہے، اسکی مغربی سرحدوں پر واقع ہیں۔ پاکستان کی مشرقی سرحدیں انڈیا سے جالگتی ہیں۔ بھارت ہندو انتہا پسندوں کے اضافے کے تجربے سے گزر رہا ہے جو اب تک تقریباً چھ سال سے اقتدار میں رہنے کے بعد عام انتخابات 2004ء میں شکست سے دوچار ہوئے۔ ہندو بنیاد پرستی کے ایک رد عمل کے طور پر بھی پاکستان میں اسلامی بنیاد پرستی مقبول ہو رہی ہے۔

☆☆☆

9422 ٥٥

ایران! بنیاد پرستی فاتح ہوتی ہے

فاروق سلہریا (جنوری 2004ء)

ایران، بہت سے دیگر مُسلم مُما لک کے برعکس، 19ویں اور بہت حد تک 20ویں صدی تک براہ راست نو آبادی نہیں بنا تھا۔ تاہم، برطانیہ کا ایران میں کافی مضبوط اثر تھا۔ برطانوی اثر ایران میں ایک شدید تبدیلی پیدا کر رہا تھا۔ یہ بے اطمینانی 1892ء میں وسیع ہڑتال کا باعث بنی۔ عُلما نے اِس ہڑتالی تحریک کی قیادت میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ایرانی عُلماء نے حزبِ اِختلاف کا کردار ادا کیا تھا۔ ایرانی عُلما کی بادشاہت کے ساتھ گٹھ جوڑ کی وجوہات صاف تھیں۔ نہ صرف ایرانی عُلماء بے شُمار مراعات سے لُطف اندوز ہوتے تھے بلکہ وہ آپسی شادیوں کی وجہ سے حکومتی طبقے کا ایک حصہ بھی بن گئے تھے۔ تاہم، 1892ء سے 1963ء تک ایرانی عُلماء حکومتی طبقے کے طرف دار ہی رہے۔

پہلی جنگِ عظیم کے دوران ایرانی محنت کش طبقے نے اپنی طاقت آزمائی اس دور میں رضا خان نے اپنے آپ کو شاہ (Monarch) کہلوانے کا اعلان کیا اور ایران کو ایرانی سرمایہ دار طبقے (bourgeoisie) اور کاروباری طبقہ کے مفاد کے پیشِ نظر جدید خطوط پر استوار کرنا شروع کر دیا۔ تاہم ملائیت کبھی بھی کھُل کر شاہ کے خلاف سامنے نہیں آئی۔

دوسری جنگِ عظیم ایرانی محنت کش طبقہ میں ایک نئی تحریک لے کر آیا۔ اِس نے محمد مُصدق کی سربراہی میں ایک قومی محاذ کی حکومت کی تشکیل کا راستہ دکھایا۔ مُصدق کی حکومت نے برطانوی اور امریکی سامراج کو ناراض کر دیا۔ ایک طرف تو تیل کو قومیا کر اور دوسری طرف وہ

محنت کش طبقے کی سرگرمیوں کی ایک نئی لہر کی وجہ سے، طبقے کی دوبارہ سے اِن سرگرمیوں کی لہر کی وجہ سے شاہ کو ملک سے بھاگنا پڑا اور مُصدق کو مزید اصلاحات جاری کرنا پڑیں۔

1953ء تک جب برطانیہ کی مدد سے تختہ اُلٹ کر اور امریکہ نے شاہ کو واپس تخت نشین کر دیا تو علماء شاہ کا ساتھ دے رہے تھے۔ شاہ کی واپسی کے بعد تودہ پارٹی نے قومی مُحاذ کی حکومت کے متعلق اُسے فرقہ پرست قرار دیتے ہوئے اپنی پالیسی کا اعلان کیا اور شاہ کی حکومت کے باعث انتہائی مُشکل حالات کی وجہ سے زیرِ زمین جانے کا فیصلہ کیا۔ بے شک حالات واقعی بے حد مشکل تھے۔ تاہم تودہ پارٹی کی اپنی بقاء کے لیے بے عمل رہنے کی حکمتِ عملی کے پیچھے بہت حد تک ماسکو کا ہاتھ تھا جو شاہ کے ساتھ تعلقات استوار رکھنا چاہ رہا تھا۔

1950ء میں تیل کے منافع کی وجہ سے شاہ ایران میں ترقی کا عمل شروع کر سکتا تھا۔ 1963ء تک بحر حال ایران ایک مرتبہ پھر وسیع بے اطمینانی کی گرفت میں تھا۔ منظر سے بائیں بازو کی غیر موجودگی کے باعث امام خمینی 1963ء میں حزبِ اِختلاف کا اہم رکن بن کر نمودار ہوا۔ جس کے ہمراہ سیکولر اور بنیاد پرست دونوں ہی تھے۔ حزبِ اختلاف کو کاروباری طبقے کی حمایت بھی حاصل تھی کیونکہ یہ مُلک میں معاشی ابتری کی وجہ سے خطرہ محسوس کر رہی تھی۔ دوسری جانب علماء بھی ناراض ہو گئے کیونکہ شاہ نے محدود زمینی اصلاحات نافذ کر دیں جس نے نہ صرف جاگیردار طبقے بلکہ علماء کو بھی ناراض کر دیا۔ زمینی اصلاحات براہِ راست اُنکی ریاستی جاگیروں کو نشانہ بنا رہی تھیں (وقف جائیدادیں)۔ اگرچہ خمینی نے شاہ کی حکومت کو ایسی حکومت قرار دے رہا تھا جو ''کفار'' پر مشتمل ہے مگر وہ کسی اسلامی انقلاب کا ذکر نہیں کر رہا تھا۔ خمینی کو گرفتار کر لیا گیا جسکے بعد ایران میں چاروں طرف بڑے پیمانے پر مظاہرے ہوئے۔ احتجاجی مظاہروں کو کُچل دیا گیا جس میں بہت سے ہلاک ہوئے۔ خمینی سے ایک معاہدہ ہوا کہ وہ سیاست سے دور رہے گا۔ خمینی نے رہا ہونے کے بعد کئی مفاہمتی تقاریر کیں۔ جلد ہی ایک مرتبہ پھر وہ شاہ کی حکومت سے ایران میں امریکی فوج کی موجودگی کے مسئلہ پر جھگڑے میں مبتلا ہو گیا جسکے نتیجہ میں اُسکی گرفتاری اور پھر آخر کار مُلک بدری

ہوئی۔ اس مرتبہ کوئی مظاہرے نہیں ہوئے۔ اگلے ۱۵ برس تک وہ ایران میں ''مُطالعاتی مراکز'' (Study Circles) کی تنظیم کرتا رہا۔ اُسنے کبھی اپنے اسلامی انقلاب کے ایجنڈے کا نام نہیں لیا۔ اِس کے برعکس وہ شاہ کی حکومت اور اُسکی زیادتیوں کے خلاف بیانات دہراتا رہا۔ وہ کسی حد تک اپنا اصل ایجنڈا اپنے مطالعاتی مراکز میں پڑھائی جانے والی اپنی تحریروں کے ذریعے سے ظاہر کر رہا تھا۔ 1977ء کے آخر تک ایران پھر انتشار میں تھا۔ تشدد کام نہیں آیا جیسے کہ وہ 1963ء میں کام آیا تھا۔ مظاہرے بڑھتے جا رہے تھے اور معاشرے کے نئے دھڑے اِس میں شامل ہو رہے تھے۔ پہلے چھ ماہ تک بنیاد پرستوں نے کوئی بڑے مظاہرے متحرک نہیں کیے۔ خمینی اس عرصے کے دوران کوئی ''اسلامی حکومت'' نہیں مانگ رہا تھا۔ وہ شاہ کی معزولی اور 1906ء کے آئین کی بحالی کا مطالبہ کر رہا تھا۔ مُنظم محنت کشوں طبقوں کے حملوں کے طریقے، جو ستمبر 1978ء تک شروع ہو چکے تھے، شاہ کی حکومت کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوئے۔ اگلے تقریباً چار ماہ میں وہ ایران سے بھاگ رہا تھا۔ انقلاب کامیاب ہو چُکا تھا۔ شاہ کے آخری دنوں میں اور اُسکے ملک بدری کے بعد ایران میں دہری حکومت موجود تھی۔ شوریٰ (ایک طرح کی سوویت) کلی طور پر طاقت میں تھی۔ تاہم، خمینی کے پوسٹر فیکٹریوں اور کام کرنے کی جگہوں پر دیکھے جا سکتے تھے۔ خمینی اب تک اپنی معاشی اصلاحات کو سامنے رکھتے ہوئے پسے ہوئے لوگوں کو ظالموں کا تختہ اُلٹنے پر اُکسا رہا تھا، اور اپنا اصل ایجنڈا واقعی ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ تو وہ پارٹی کوئی متبادل پیش کرنے سے قاصر تھی۔ اس نے بلکہ بنیاد پرستوں کے ساتھ اتحاد کر لیا: ایک ایسی غلطی جو ایرانی بائیں بازو کو بہت مہنگی پڑی۔ ایک ایسا دھچکہ جس سے ایرانی بائیں بازو کے لوگ 25 سال گُزرنے کے بعد بھی، ابھی تک سنبھل نہیں سکے۔

خمینی نے اقتدار میں آنے کے بعد شوریٰ کو تباہ کرنا شروع کر دیا۔ بایاں بازو اور ٹریڈ یونین سرگرمیاں کُچل دی گئیں۔ ایران کو خون کا غسل دیا گیا۔ جب وہ شوریٰ کو کُچل رہا تھا تو وہ پارٹی محض ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھ رہی تھی جس کو کچھ ماہ بعد اسی عمل سے گزرنا پڑا۔

☆☆☆

اسلامی بنیاد پرستی: سامراج مخالف نہیں

فاروق سلہریا (جنوری2004ء)

سامراج مُخالف نہیں ہے!

حربی اور سیاسی اسلام کے عروج کو سمجھنے کے لئے کوئی آسان، سادہ یا ایک مربوط وضاحت موجود نہیں ہے۔ایک وجہ یہ حقیقت بھی ہے کہ ''عالمِ اسلام'' بورژوا جمہوری انقلابات سے نہیں گزرا، جیسا کہ یورپ کے معاملے میں ہوا۔ مذہب کو سیاست سے الگ نہیں کیا جا سکا۔ کُچھ مسلم ممالک مسخ شدہ سٹالینی طرزِ انقلاب کے تجربات سے گذرے۔ مگر ایک مضبوط، قابلِ عمل جمہوریت کسی بھی مسلم ملک میں قائم نہ ہو سکی۔ آج کے دور میں، پاکستان، بنگلہ دیش، ترکی اور انڈونیشیا نام نہاد جمہوریتیں ہیں۔ مگر ہر جگہ فوج جمہوری حکومتوں سے زیادہ طاقتور ثابت ہو رہی ہے۔ یہ ایک ایسی صورتحال کی طرف لے جاتا ہے جہاں انتہا پسند قوتیں اور تصورات پنپ گئے ہیں۔

اسکے علاوہ، پچھلی دہائی، نظریاتی پراگندگی کا دور رہی ہے، جسکے بعد سوویت یونین کا انہدام ہوا۔ انتہائی دایاں بازو کے تصورات دنیا بھر میں تیزی سے بڑھے ہیں، شاید ماسوائے لاطینی امریکہ کے۔ یورپ میں یہ انتہائی دایاں بازو ہی تھا جس نے سوشل ڈیموکریٹک پارٹیوں کے کنگال پن سے پیدا ہونے والے خلا کو پُر کیا۔ کچھ جگہوں پر، انتہائی بائیں بازو نے بھی، جہاں اسکی کُچھ بنیادیں موجود تھیں، فائدے اُٹھائے ہیں۔ مثال کے طور پر جیسے فرانس امریکہ میں عیسائی دایاں بازو، مضبوط ہُوا ہے۔ بھارت میں ہندو بنیاد پرستی نے آگے کی طرف لمبی چھلانگیں لگائی ہیں۔ ایک ایسا مظہر جو مغربی دنیا میں نا قابلِ توجہ رہا ہے۔

انتہا پسند تصورات جو'' جنگجو اسلامی رجحان'' میں ظاہر ہوتے ہیں، اُن انتہا پسند تصورات سے مماثلت رکھتے ہیں، جو نیونازی ازم کی شکل میں بیان کئے جاتے ہیں اور ہندو بنیاد پرستی میں پہچانے جاسکتے ہیں جب یہ اقلیتوں پر ظلم کرتی ہے۔تاہم اسلامی بنیاد پرستی دوسری انتہائی دائیں بازو کی ہم عصر تحریکوں سے اسکے سامراجیت کے ساتھ تعلق کی وجہ سے مختلف ہوجاتی ہے۔یہ ابھی تک، انتہا پسندی کی حد تک سامراج مخالف رہی ہے۔ان معاملات نے بائیں بازو کی جماعتوں میں دونکتوں پر بحث کا راستہ دکھایا ہے۔پہلا: کیا بائیں بازو کو بنیاد پرستوں سے اتحاد کر لینا چاہیے اُنہیں سامراج مخالف سمجھتے ہوئے؟ دوئم: کیا اسلامی بنیاد پرستی فسطائیت (Fascism) ہے؟

اسلامی بنیاد پرستی کا سامراج مخالف کردار سمجھنے کے لیے ہمیں سرد جنگ کے دور میں سامراجیت اور اسلامی بنیاد پرستی کے درمیان تعلق کی تاریخ دیکھنی ہوگی۔اسلامی بنیاد پرستی سامراجی منافقت کی ایک روشن مثال پیش کرتی ہے۔اب امریکہ اور سامراجی مغرب اسلامی بنیاد پرستی کے سب سے بڑے دشمن بنے ہوئے ہیں اور مغرب کے مزدور طبقہ کے سامنے اسلامی بنیاد پرستی کو امن کے خلاف سب سے بڑا چیلنج پیش کر کے بے وقوف بنانے کی کوشش کررہے ہیں۔مگر یہ وہی سامراج ہے جس نے ان بنیاد پرست طاقتوں کو مختلف مسلم ممالک میں بائیں بازو کے خلاف استعمال کیا۔

1950ء اور 1960ء کی دہائیوں میں سامراج مُخالف، پاپولسٹ (Populist) اور طبقاتی تحریکوں کو عروج حاصل ہوا۔امریکہ نے بنیاد پرستوں کی سرپرستی کا ایک منصوبہ تیار کیا تاکہ ان عوامی تحریکوں کو کمزور کیا جاسکے، کیونکہ سامراج خوفزدہ تھا کہ یہ تحریکیں سوشلزم پر جا کر منتج ہونگی۔ سی آئی اے نے امریکی سیکریٹری آف سٹیٹ، جون فوسٹر ڈل (John Foster Dulles) کی راہبری میں مختلف ممالک میں بنیاد پرست جماعتوں کے ساتھ آشنائی قائم کی۔منصوبے کے مطابق، اخوان المسلمین کے نام سے ایک نیٹ ورک جسے مقبولِ عام مسلم بھائی چارہ (مصر)،

حماس (شام)، سراکت الاسلام (انڈونیشیا)، اسلامک سالویشن فرنٹ (الجزائر) اور جماعتِ اسلامی (پاکستان) قائم کیا گیا۔ان جماعتوں کو اس دور میں مکمل معاشی اور سیاسی امداد دی گئی۔

یہ عمل 1980ء کی دہائی میں اپنے عروج پر پہنچا جب ہزاروں کی تعداد میں جنگجو یا نام نہاد مُجاہدین تیار کیے گئے اور افغانستان بھیجے گئے۔ پاکستان کی جماعتِ اسلامی نے بنیادی فوج مہیا کی مگر درجِ بالا جماعتوں نے بھی اپنا اپنا حصہ بھیجا۔

سامراج اور بنیاد پرستی کا شرمناک گٹھ جوڑ 1977ء میں وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف ایک تحریک کے دوران سامنے آئی۔ بنیاد پرستوں نے 1977ء میں، الیکشن میں دھاندلی کے الزام پر بھٹو کے خلاف ایک تحریک شروع کی۔ کچھ بائیں بازو اور کچھ بورژوا پارٹیاں بھی مذہبی پارٹیوں کے ساتھ مل گئیں۔ بھٹو ایک عوامی لیڈر کے طور پر سامنے آیا تھا اور خطے میں سامراجیت کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

اسی طرح، جب جماعت اسلامی کا ایک جلوس لاہور کے امریکی مرکز کے سامنے سے گزرا تو ایک امریکی افسر نے اسے خوش آمدید کہا اور ہاتھ ہلایا، جبکہ جلوس کے شرکاء نے امریکہ کی حمایت میں نعرے لگائے۔

جنگ میں ہزاروں کی تعداد میں گوریلوں نے، سی آئی اے اور پینٹاگون کی کمان میں افغان انقلاب کے خلاف جنگ لڑی۔ اُسامہ بن لادن اُس وقت ہیرو تھا۔ لیکن بعد از سرد جنگ صورتحال نے جیسا کہ ذکر آچکا ہے اُنہیں کم از کم تین وجوہات کی بنا پر اختلافی صورتحال میں لا کھڑا کیا ہے۔ ایک سیاسی خلا پیدا ہو گیا تھا کیونکہ سوویت یونین کے انہدام کی وجہ سے عالم اسلام میں ٹریڈ یونینز اور بائیں بازو کی تحریکوں کو نقصان پہنچایا، جیسا کہ دوسری جگہوں پر ہوا۔ بنیاد پرست جماعتوں کی سامراج کی طرف سے مالی اور سیاسی معاونت رُک گئی۔ سامراج کو کیمونسٹوں کی جگہ پر اب ایک اور طاقتور دشمن کی ضرورت تھی۔ اس نئی صورتحال میں سامراجیت اور بنیاد پرستی دونوں کے مفاد میں تھا کہ وہ ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں۔ بنیاد پرستوں کو سیاسی طور پر فائدہ ہونا شروع ہو گیا

جب انہوں نے خود کو سامراج مخالف ظاہر کرنا شروع کر دیا، جبکہ سامراجیت کے پاس اب ''اسلامی دہشت گرد'' آ گئے تا کہ وہ مزدور طبقہ کو بے وقوف بنا کر دفاع کے بڑے بجٹ کا جواز دے سکے۔

11 ستمبر کے واقعات نے اس صورتحال کو اور تقویت پہنچائی۔ مگر کیا یہ سامراج اور بنیاد پرستی کی دشمنی حقیقی اور دیرپا ہے؟ نہیں۔ جونہی ایک مزدور طبقے کی تحریک سامراج اور طبقاتی ڈھانچے کے لیے خطرہ بنے گی تو سامراجیت اور بنیاد پرستی کے پرانی منافقت پر مبنی اتحاد کی تجدید ہو گی۔ تاہم، اُس سے پہلے، بنیاد پرستی کے خلاف مغرب میں مزدور طبقوں میں مضبوط احساس کی وجہ سے، سامراج کھل کر کسی بنیاد پرست تحریک کی حمایت نہیں کرے گا۔ بنیاد پرست ایرانی حکومت، عراق کے شیعہ، یا چیچنیا کے باغیوں کے ساتھ خفیہ معاہدے ہو سکتے ہیں مگر ایک کھلا الحاق نہیں ہوگا۔ اسی طرح، طالبان کے تجربے کے بعد، سامراج شاید ہی کسی بنیاد پرست تحریک کو اقتدار میں آنیکی حمایت کرے گا۔ مگر یہ ہر جگہ کے لیے حتمی نہیں کہا جا سکتا، سامراجی ممالک کی اندرونی خلفشاروں کی وجہ سے، سامراجیت کا ایک حصہ مخصوص بنیاد پرستوں کی تحریکوں کی حمایت کر سکتا ہے جبکہ سامراجیت کا دوسرا حصہ انکی مخالفت۔

یہ بہت ممکن ہے، کہ جب تک ایک انقلابی صورتحال نہیں اُبھرتی، سامراج اور بنیاد پرستی کے درمیان موجودہ اختلافی صورتحال دونوں کے مفاد میں ہوگی اور بنیاد پرست گاہے بگاہے سامراجیت کے لیے مشکلات پیدا کرتے رہیں گے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا بائیں بازو کو ان سامراج مُخالفوں کے ساتھ الحاق کر لینا چاہیے؟ سبق سیکھنے کے لیے ایک مثال ایران کی ہے جہاں بائیں بازو نے خمینی کی طاقتوں کے ساتھ الحاق کیا۔ خمینی نے حکومت پر قبضہ کرتے ہی ایران سے بائیں بازو کا صفایا کر دیا۔ ایرانی بایاں بازو جو اُسوقت کے ''عالمِ اسلام'' کے سب سے طاقتور ترقی پسند لوگوں پر مبنی بایاں بازو تھا، ابھی تک سنبھلنے کے قابل نہیں ہو سکا۔

بنیاد پرستوں کے ساتھ الحاق کو رد کرنے کی بنیاد جذبات پر مبنی نہیں ہے بلکہ تاریخی

تجربات پر مبنی ہے۔ جب ایک انقلابی پارٹی ایک الحاق تشکیل دیتی ہے تو وہ مزدور طبقے میں اپنی ساتھی جماعت کے بارے میں کچھ خوش فہمیاں بھی پیدا کرتی ہے۔ بنیاد پرستوں کے متعلق کوئی بھی خوش فہمی پیدا کرنا بائیں بازو کے لیے خودکش ہے۔

ایسے الحاق کے بعد کوئی متبادل بننے کے مواقع بہت کم یا شاید معدوم ہی ہو جاتے ہیں۔ اگر بنیاد پرست ایک الحاق کے نتیجے میں جیت جاتے ہیں تو وہ سب سے پہلے بائیں بازو کو فنا کرتے ہیں۔ ایران اسکی بہترین مثال ہے۔ اگر بنیاد پرست اقتدار میں آجاتے ہیں تو بائیں بازو کو مزاحمت کرنا پڑے گی اور یہ آسان نہیں ہوگا اگر بایاں بازو پہلے رفیق رہ چکا ہو۔ دوسری جانب، اگر بایاں بازو کبھی بھی رفیق نہ رہا ہو تو بنیاد پرست کامیاب ہوں یا ناکام، یہ فائدہ مند ہوگا۔ بنیاد پرستوں کی ناکامی کی صورت میں، بایاں بازو ایک متبادل کے طور پر اُبھر سکتا ہے بشرطیکہ اس نے اپنے آپ کو بطور متبادل پہلے سے پیش کیا ہو۔ اور اگر بنیاد پرست کامیاب ہو جاتے ہیں تو بائیں بازو کی مزاحمت، خواہ وہ ناکام ہی ہو جائے، ایک اہم مقام رکھے گی اور مستقبل کی اساس رکھ سکتی ہے۔

الحاق نہ صرف بائیں بازو کے لیے بلکہ مزدور طبقے کے لیے بھی خودکش ثابت ہو سکتا ہے۔ کسی قسم کی حمایت، خاص طور پر ایسے موقع پر جب انکے جیتنے کے مواقع ہوں، خواتین، اقلیتوں، مظلوم شہریوں اور مزدور طبقہ پر ظلم کی حمایت کرنے کے مترادف ہوگا۔

اسلامی بنیاد پرستی ہر جگہ پر خواتین، مذہبی اقلیتیں، اور مظلوم شہریوں کو نشانہ بناتے رہے ہیں۔ یہ پہلو اُن میں اور فسطایوں (Fascists) میں ایک جیسا پائیں گے۔

اس سوال کا جواب دینا بہر حال مشکل ہے کہ آیا اسلامی بنیاد پرستی فسطایت ہے یا نہیں؟ بنیاد پرست، بلکہ، کچھ معاملات میں بدتر ہیں۔ وہ فن اور ادب کو برداشت نہیں کرتے۔ وہ اپنے تمام مُخالفوں کو مادی طور پر فنا کر دینے پر یقین رکھتے ہیں۔ اُنکے نزدیک مزدور اور سرمایہ دار ریاستیں یکساں نفرت کے قابل ہیں۔ اُنکے لیے کیوبا اور امریکہ دونوں کافروں کے ملک ہیں لہذا وہ دشمن ہیں۔

☆☆☆

منشیات کے ذریعے ''جہاد''

فاروق سلہریا (اپریل 2004ء)

2004ء کے آغاز میں امریکی ذرائع ابلاغ نے ''منشیات کی آمدنی نے القاعدہ نیٹ ورک کو سنبھالا ہوا ہے'' لکھ کر خطرے کی گھنٹیاں بجادیں۔ آج کل مغربی بڑے اخبارات کا تکیہ کلام القاعدہ اور پوسٹر بوائے اُسامہ ہے۔ کیونکہ یہ بکتا ہے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف القاعدہ ہی نہیں جو منشیات کی آمدنی پر چل رہی ہے۔ دہشت گردی کی سرگرمیوں میں ملوث بنیاد پرستوں کا سارا نیٹ ورک دیگر ذرائع آمدنی کے علاوہ بنیادی طور پر منشیات کی آمدنی پر قائم ہیں۔ امریکہ کے اپنے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ (State Department) کے مطابق القاعدہ کے علاوہ 12 مزید دہشت گرد تنظیمیں منشیات کے کاروبار میں مصروف ہیں۔

بعد از سرد جنگ دور میں اسلامی بنیاد پرستی کے عروج نے دنیا بھر کی بہت زیادہ توجہ حاصل کی ہے۔ اکثر اسے دہشت گردی کے حربوں کے ذریعے اسلام کے سیاسی اظہار کے ایک مظہر کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ 11 ستمبر کے حملوں نے اس تاثر کو عالمگیر ہونے میں مدد دی۔ درحقیقت یہ سچ نہیں ہے۔ انفرادی دہشت گردی کا طریقہ اسلامی بنیاد پرستی کی تمام روشوں کے مابین مشترکہ خصوصیت نہیں ہے۔ یہ درحقیقت اسلامی بنیاد پرستی کا ایک دھڑا ہے جس نے جہاد کے نام پر پرتشدد طریقہ کار اپنایا ہے۔ یہ وہ نام نہاد جہادی برانڈ کا دھڑا ہے جسکا لوگو (Logo) اُسامہ ہے۔ ان تمام جہاد برانڈ کے گروپوں کا ایک مشترکہ بندھن ہے! افغانستان اور ایک مشترکہ دلچسپی ہے! منشیات کی تجارت۔

یہ سب افغانستان کی جنگ سے شروع ہوا۔ افغانستان 1978ء کے انقلاب کے بعد

پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی آف افغانستان (PDPA) اقتدار میں آ گئی۔ پی ڈی پی اے کی حکومت نے جمہوریت، زرعی اصلاحات، عورتوں کی آزادی، تعلیم اور کئی ترقی پسند منصوبوں کا وعدہ کیا۔ اگرچہ جمہوریت کیمونسٹوں کا سب سے بڑا شکار بنی تاہم اُنہوں نے زرعی اصلاحات اور دوسرے ترقی پسند اقدامات کیے۔ بشمول عورتوں کو حقوق دینا۔ افغان ملائیت جو افغانی جاگیردار طبقے کے ایک بڑے حصے پر مشتمل تھی زرعی اصلاحات کا بری طرح شکار ہوئی۔ انہوں نے نئی اصلاحات کی مزاحمت میں ہتھیار اُٹھا لیے۔ امریکہ نے پاکستان کے ذریعے مدد پہنچائی۔ سوویت یونین نے 'انقلاب' کو بچانے کے لیے ملک کے اندر مارچ کیا۔ 'کارٹر' کی انتظامیہ نے سوویت یونین کو اسکا ویت نام بنانے کا فیصلہ کیا۔ حکمت عملی یہ تھی کہ تمام ایسے ممالک سے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، سے بھرتی شدہ گوریلوں کی ایک فوج کے ذریعے ایک پراکسی وار شروع کی جائے۔ یہ گوریلا فوج کسی ایک کمان اور کنٹرول کے زیر اثر نہیں تھی۔ سات افغان کمانڈر اپنے فوجی دستوں کی قیادت کر رہے تھے۔ اسلحہ اور تربیتا ور پاکستان کی آئی ایس آئی نے فراہم کیں۔ سرمایہ 'خفیہ ذرائع' سے اندر آ رہا تھا۔ ایک بڑا ذریعہ 'منشیات کی آمدنی' تھا۔ ہر چیز سی آئی اے کی رضامندی سے کی جا رہی تھی۔ سات افغان کمانڈروں میں سے ایک، گلبدن حکمت یار جو امریکی اسلحہ اور حمایت کا سب سے بڑا وصول کنندہ تھا، منشیات کا بھی بڑا تاجر بن گیا جسکی اپنی ہیروئن کی لیبارٹریاں تھیں۔ 1989ء میں افغان جنگ کے اختتام پر یہ سات گروپ 800 ٹن سے زائد افیم کی پیداوار کو کنٹرول کر رہے تھے جو پاکستان اور ایران کی مشترکہ سالانہ پیداوار سے بھی زائد تھی۔

1982ء میں افغانستان میں ''جہاد'' کی ابتداء کے وقت، افغانستان میں افیم کی پیداوار 300 ٹن تک تھی۔ ایک دہائی قبل سے موازنہ کرتے ہوئے یہ 200 فیصد کا اضافہ تھا۔ قبل ازیں 1971ء میں افغانستان کی افیم کی پیداوار محض 100 ٹن تھی۔ سوویت فوجوں کے انخلاء کے کچھ عرصہ بعد بنیاد پرست افغانستان میں طالبان کے زیرِ حکومت طاقت کی نئی بلندیوں تک پہنچ رہے تھے۔ جیسے جیسے بیسوی صدی اپنے اختتام تک پہنچ رہی تھی، افغانستان میں افیم کی پیداوار 3100 ٹن

تک پہنچ چکی تھی۔ 1999ء میں یہ 4600 ٹن سے خشک موسم کی وجہ سے نیچے آ گئی تھی۔

پاکستان افغانستان کا ہمسایہ اور ان ''مجاہدین آزادی'' و منشیات کے سیٹھوں کا پہلا پڑاؤ ہونے کی وجہ سے اس منشیات کے مظہر کا پہلا شکار اور کردار بنا۔ افغان جنگ سے پہلے 1980ء تک پاکستان میں ہیروین کے نشے کا عادی ایک بھی درج شدہ نہیں تھا۔ 1989ء تک ہیروئن کا نشہ کرنے کی تعداد 17 لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔ اُس وقت سے آج تک یہ تعداد کم نہیں ہوئی۔

جونہی آخری روسی فوج عمو دریا عبور کر کے سوویت علاقے میں داخل ہوئی تو سی۔آئی۔اے کے مرکزی دفتر لینگلے (Langley) میں سی آئی اے کے افسران نے اخراج کا جشن منایا۔ اب آئندہ کے لیے افغانستان کو نہ صرف سی آئی اے بلکہ امریکی انتظامیہ نے بھی چھوڑ دیا۔ تاہم، سی آئی اے تخلیق کردہ القاعدہ اینڈ کمپنی نے از خود مرنے سے انکار کر دیا۔ اسکے بر عکس، سی آئی اے کے بنائے ہوئے روبوٹس جو جہاد کے لیے تیار کیے گئے تھے نے اپنے طور پر جہاد لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ جہاں کہیں بھی یہ ممکن تھا۔ فلپائن، بوسنیا، چیچنیا اور کشمیر۔ صرف ''کافروں'' کے ممالک میں ہی نہیں جہاں مسلمانوں کو قتل کیا جا رہا تھا بلکہ مصر، الجزائر، سعودیہ، تیونس اور سوڈان جہاں مسلمان حاکم امریکی مفادات کی خدمات انجام دے رہے تھے۔

''جہاد'' کا دائرہ اب بڑھ چکا تھا اور اسکے ساتھ ہی ''جہاد'' کا بجٹ بھی۔ اس دوران سرمائے کی کئی پائپ لائنیں بھی خشک ہو چکی تھیں۔ بہترین اور میسر متبادل یہی تھا کہ منشیات کی تجارت پر انحصار میں اضافہ کیا جائے۔

بعد از افغان زمانہ جہاد کے دوران نئی بننے والی جماعتیں تقریباً کلی طور پر منشیات کی تجارت پر انحصار کرتی تھی۔ ''اُزبکستان کی اسلامی تحریک'' (IMU) ایک ایسی ہی ایک جماعت ہے۔ نامانگانی (Namangani) جو آئی ایم یو کے باس ہیں، محض اس جہادی تنظیم کی قیادت ہی نہیں کر رہے بلکہ منشیات کی تجارت میں پوری طرح ڈوبے ہوئے ہیں۔ 1999ء میں آئی ایم یو کے 600 مسلح گوریلے اپنے خاندانوں کے ساتھ افغانستان چلے گئے۔ اُسی سال نامانگانی

اُسامہ بن لادن سے ملا۔ آئی ایم یو کو طالبان نے سہولیات مہیا کیں، اس شرط پر کہ آئی ایم یو طالبان کو شمالی اتحاد کے ساتھ لڑائی میں مدد کرے گا۔ اس کے بدلے میں آئی ایم یو کو طالبان نے منشیات کی تجارت کے لیے سہولیات پہنچائیں۔ آئی ایم یو کی افغانستان میں اپنی لیبارٹریاں ہیں۔

طالبان کو ''اصلی اسلام'' نافذ کرتے ہوئے، جو منشیات کی ممانعت کرتا ہے، ایک طرف تو افیم کی کاشت میں کوئی مسئلہ نہیں ہوا کیونکہ یہ انکی آمدنی کا بڑا ذریعہ بن گیا۔ دوسری طرف طالبان لیڈرشپ نے اس 'غیر اِسلامی' آمدنی کو جائز بنانے کے لیے حشیش پر پابندی لگادی کیونکہ وہ افغانی اور مسلمان استعمال کرتے تھے مگر افیم کی اجازت دے دی کیونکہ وہ مغرب میں غیر مُسلم استعمال کرتے تھے۔

یہ کوئی نیا نہیں تھا۔ لبنان سے متعلقہ حزب اللہ نے 1980ء کے اوائل میں منشیات کی تجارت کی اجازت کے لیے ایک فتویٰ جاری کیا تھا یہ کہتے ہوئے کہ ''ہم یہ منشیات شیطان امریکہ اور یہودیوں کے لیے بنا رہے ہیں۔ اگر ہم اُنہیں بندوقوں سے نہیں مار سکتے تو ہم اُنہیں منشیات سے ماریں گے۔''

طالبان اور آئی ایم یو کے ملاپ کا وسطی ایشیا کے خطے میں منشیات کی تجارت پر بے حد اضافے کی صورت میں اثر پڑا۔ انٹرپول کے مطابق، افغان افیم کا 60 فیصد حصہ وسطی ایشیا کے راستے سے پہنچ رہا تھا۔ اُس میں سے یہ کہا جاتا ہے کہ آئی ایم یو کا اس منشیات کی تجارت میں 70 فیصد حصہ تھا۔ ناگامانی اپنے ممبران کے نیٹ ورک اور چیچن بنیاد پرستوں کے رابطے استعمال کرتے ہوئے وسطی ایشیا میں منشیات کی تجارت میں کامل پختگی حاصل کر رہا تھا۔

جو سچ آئی ایم یو کے لیے ہے وہی سچ کوسوالبریشن آرمی (KLA) اور سابقہ یوگوسلاویہ میں دوسرے مسلم گروپوں کے لیے بھی ہے۔ اس پہلو نے اکثر و بیشتر توجہ مبذول نہیں کی۔ یہ شرمندگی کا باعث تھا کیونکہ امریکہ اور اسکے حواری القاعدہ اور ایران کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سربیا کے خلاف جنگ لڑ رہے تھے۔ اس خطے کو بحرحال ایک بھاری قیمت چُکانا پڑی۔

2004ء میں ہی میساڈونیا کی وزارتِ داخلہ نے دہشت گرد جماعتوں اور منشیات کی تجارت میں ایک تعلق کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح سکاٹ لینڈ کے حکام نے ایک رپورٹ جاری کی ہے جس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ البانوی اسلامی نیٹ ورک نے 2002ء میں یورپی شہروں میں بیچی گئی۔ ہیروئن کے کم از کم 4 ملین منافع کو ہتھیاروں کی خرید میں استعمال کیا ہے جس میں SA-18 اور SA-7 زمین سے فضا میں مار کرنے والے میزائل بھی شامل ہیں۔ ایک مغربی انٹیلی جنس کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ کوسووو میں 900 ملین جرمن مارک پہنچائے گئے ہیں۔ جب سے گوریلوں نے وہاں آپریشن شروع کیا ہے اور اسکا نصف کہا جاتا ہے کہ منشیات کی غیر قانونی رقم ہے۔ کے ایل اے (KLA) ہتھیاروں کے لیے نہ صرف جرمن مارک بلکہ ہیروئن کے ذریعے سے بھی ادائیگی کر رہی تھی۔

1994ء میں برطانوی مشہور اخبار 'گارڈین' اپنی یکم نومبر کی اشاعت میں تنبیہ کرتا ہے ''البانیہ'' کے منشیات کے سیٹھوں نے جنگ کا اپنا طریقہ ڈھونڈھ لیا ہے''۔ گارڈین کی اس رپورٹ کی گونج بار بار یورپین پریس میں سنی گئی۔ نہ صرف ذرائع ابلاغ بلکہ پولیس کے سُراغ رساں بشمول سویڈش پولیس کی ایک تفتیش نے اور یورپی یونین کی رپورٹس نے کے ایل اے اور منشیات کی تجارت کے درمیان تعلق کی نشاندہی کی۔ بعد میں نیشنل لبریشن آرمی (NLA) جو کے ایل اے سے الگ ہوا ایک حصہ تھا میساڈونیا میں سرگرم عمل ہو گیا۔ مقصد البانویوں کو بچانا نہیں تھا بلکہ پُرکشش منشیات کی تجارت پر اختیار رکھنا تھا۔ آج کے دور میں مسلمانوں کی اکثریت والے ممالک میں سول سوسائٹیوں کو جہاد کے نام پر عمل پیرا دہشت گرد جماعتوں نے یرغمال بنایا ہوا ہے۔ مصر کی الجہاد سے لے کر اُزبکستان کی آئی ایم یو تک ایک ہی کہانی ہے۔ جو محض مسلم دنیا تک محدود نہیں۔ انہوں نے اپنے ''جہاد'' کو عالمگیر کر لیا ہے۔ فلپائن سے لے کر کشمیر تک اور اسرائیل سے لے کر امریکہ تک اُنہوں نے مسلمان بھائیوں کو ''کافروں'' کے چنگل سے آزاد کرنے کا بیڑہ اُٹھا لیا ہے۔ اس عمل میں وہ ''مسلم دنیا'' اور اس پر ظلم کرنے والوں کے لیے مصیبت لے کر

آئے ہیں۔منشیات اسکا محض ایک پہلو ہے۔

ان غلطیوں کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اسلامی بنیاد پرست منشیات کی تجارت صرف سی آئی اے کی معاونت کے ساتھ ہی بڑھا سکی تھی۔اگر القاعدہ اینڈ کمپنی منشیات کے ذریعے جہاد کے مجرم ہیں تو یہ سی آئی اے تھی جس نے منشیات کے ذریعے ''جہاد'' کو ترقی دی۔اسکا فیصلہ کرنا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے کہ کس کو الزام دیا جائے منصوبے کو سوچنے والا یا اسے عملی جامہ پہنانے والا! منشیات کے ذریعے ''جہاد'' کے معاملے میں صرف تاریخ ہی حتمی فیصلہ دے سکتی ہے۔

☆☆☆

مذہبی جنونیت

متحدہ مجلس عمل کی مقبولیت کا گھوڑا کب بدکے گا

مذہبی جنونیوں کے خطرناک رجحان کو لگام دینے کی ضرورت ہے

فاروق طارق (مارچ 2003ء)

یکے بعد دیگرے سماجی، سیاسی اور اقتصادی سطح پر مذہبی جنون حاوی ہو رہا ہے۔ ان کے بڑھتے ہوئے اثرات کے تمام تر پہلو نظر آ رہے ہیں۔ سماج میں جنونیت بڑھ رہی ہے اور مذہبی جنونی متحدہ مجلس عمل کی صورت میں مقبولیت کے ایک نئے گھوڑے پر سوار ہیں۔ سرحد اور بلوچستان میں واضح اکثریت لینے کے بعد وہ پنجاب اور سندھ میں بھی پنجے گاڑھ رہے ہیں۔ نہ صرف سیاسی میدان میں بلکہ سماجی طور پر بھی ان کا اثر روز بروز بڑھ رہا ہے۔ دہائیوں سے سیاسی میدان میں علیحدہ رہنے کے بعد اب وہ مین سٹریم سیاست کا حقیقی معنوں میں مزا چکھ رہے ہیں۔ ایک صوبے میں اپنی حکومت ہے۔ دوسرے میں شراکت سے اقتدار میں شامل ہیں اور بقیہ دونوں میں بھی ان کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا اظہار 10 اکتوبر 2002ء کے عام انتخابات کے بعد ضمنی انتخابات میں کارکردگی سے نظر آتا ہے۔ راولپنڈی میں شیخ رشید کی چھوڑی ہوئی قومی اسمبلی کی سیٹ متحدہ مجلس عمل واضح اکثریت سے جیتنے میں کامیاب ہوگئی۔ لاہور کے صوبائی اسمبلی کے ضمنی انتخاب میں ہارنے کے باوجود تقریباً 14 ہزار ووٹ لے گئے۔

پاکستان میں یہ ایک انتہائی خطرناک رجحان ہے جس کا انتہائی سنجیدگی سے نوٹس لیتے ہوئے اسے روکنے کے سیاسی اقدامات اور عمل کو آگے لانا چاہیئے۔ مذہبی جنونیت کا ابھار بڑی سرمایہ

دار پارٹیوں پر عوام کا عدم اعتماد ہے۔ پیپلز پارٹی اس کے مختلف گروپ، مسلم لیگ کی مختلف دھڑا بندیاں اور ان سب کا عوام کے بنیادی مسائل حل کرنے میں ناکامی، مذہبی جنونیت کے سیاسی ابھار کی بنیادی وجہ ہے۔ عوام کب تک کبھی ایک کبھی دوسرے کو آزماتے رہتے؟ مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی نے 1988ء سے 1999ء تک دو، دو دفعہ اقتدار حاصل کیا اور دونوں مرتبہ عوام کے اعتماد کو دھوکہ دیا۔ کیا یہ ایک genuine ابھار ہے یا مصنوعی؟ کیا یہ وقتی ابھار ہے یا کچھ عرصہ چلے گا؟ مذہبی جنونیت کا کیا مستقبل ہے؟ اس کو دیکھے جانچے بغیر پاکستان پر سپیکٹوز کی بات نہیں کی جا سکتی۔

مستقبل کے سیاسی رجحانات کا اندازہ کرنا انقلابیوں کا اہم فریضہ ہوتا ہے۔ اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب رہتے ہیں تو انہیں اپنی حکمت عملی بنانے میں آسانی رہتی ہے اور اگر ان کے خیال کے مطابق حالات نے جنم نہیں لیا تو پھر ان معروضی حالات اور وجوہات کو از سر نو دیکھنے کی ضرورت ہے تا کہ دوبارہ غلطی نہ ہو۔ شائد پاکستان میں بہت کم ایسے سیاسی عناصر ہوں جنہوں نے واضح انداز میں ہماری طرح مذہبی جنونیت کی حالیہ سیاسی کامیابیوں کا حقیقی ادراک وقت سے قبل کر لیا ہو۔ ہم نے بار بار لیبر پارٹی پاکستان کی نیشنل کمیٹی (NC) اجلاس میں یہ کہا کہ مذہبی جنونی عناصر پندرہ سے بیس فیصد ووٹ لے کر جا سکتے ہیں۔ اور یہ کہ اس خطرناک رجحان کو روکنے کی تدبیریں کرنی چاہیں۔

مذہبی جنونی قوتوں کے موجودہ ابھار کی بنیادی وجوہات تلاش کرتے ہوئے اکثر ساتھی اسے ریاستی سازش اور پشت پناہی کہہ دیتے ہیں۔ کوئی سازش اس وقت تک مقبول عام نہیں ہو سکتی جب تک اسکے پھیلنے کی معروضی بنیادیں موجود نہ ہوں۔ ریاستی پشت پناہی، مذہبی جنونی عناصر کو ایک عرصہ سے ہے۔ یحییٰ خاں، بھٹو کا آخری دور، ضیاء الحق سب نے مذہبی جنونی سیاسی عناصر کی کسی نہ کسی صورت پشت پناہی کی۔ مگر ان ادوار میں وہ کبھی بھی عوام میں مقبولیت حاصل نہ کر سکے۔ یہ صرف مشرف دور میں خاص طور پر ہوا کہ وہ عالمی اور مقامی حالات بن گئے، جن میں یہ پروان چڑھ گئے۔ مذہبی جنونیت کے ابھار کو دیکھنے کے لیے عالمی حالات کا ادراک کرنا ضروری

ہے۔ پاکستان میں سوشلسٹ پراسپیکٹوز کے لیے لازمی ہے کہ اسے عالمی عینک سے دیکھا جائے۔ مارکسزم اگر عالمگیریت پر مبنی نہیں تو پھر یہ کچھ بھی نہیں۔

پاکستان کے اردگرد افغانستان، ایران اور کشمیر میں ایک عرصہ سے مذہبی جنونی قوتیں مختلف شکلوں میں موجود ہیں۔ ایران میں مذہبی جنونی انقلاب 1979ء سے ہے۔ افغانستان 1992ء سے لیکر 2001ء کے آخر تک مذہبی جنونیوں کے کنٹرول میں رہا۔ جبکہ کشمیر میں بھی ان کی ایک عرصہ سے سیاسی مداخلت جاری ہے۔ ان میں سے خاص طور پر افغانستان اور کشمیر، مذہبی جنونی عناصر کے لیے ایک ٹریننگ کیمپ ثابت ہوئے۔ پاکستان سے جتھوں کے جتھے ان علاقوں میں نظریاتی اور فوجی ٹریننگ لیتے رہے ہیں۔ 1980ء کی دھائی میں امریکی سامراج کی پشت پناہی سے 30 ارب ڈالر سے زائد رقم افغانستان میں سوویت افواج کے نکالنے کے نام پر پاکستانی ریاست اور مذہبی جنونی عناصر نے خرچ کی۔ اس کا اثر پاکستان میں مذہبی مدرسوں کے فروغ اور مذہبی قوتوں کے پاس بے شمار اثاثہ جات کی صورت نظر آیا۔ مقامی چوہدری پر انحصار کرنے والا، جمعہ اور عید نمازوں پر تکیہ کرنے والا مولوی، اس بڑی رقم کے آنے کے بعد کافی حد تک مالی طور پر آزاد ہو گیا۔

عالمی پس منظر

مذہبی جنونیت کے فروغ کی عالمی وجوہات میں فلسطین میں امریکی سامراج کی مدد سے صیہونی قوتوں کے بے دریغ جبر کے واقعات شامل ہیں۔ جن کو دیکھ کر مسلم دنیا میں مذہبی جنونی قوتوں کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے۔ لیکن فیصلہ کن واقعہ 11 ستمبر کا ہے جب مذہبی جنونی عناصر کو امریکی سامراج نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹا گون پر حملہ کرنے کا ذمہ دار قرار دیا اور اس کے بعد افغانستان میں طالبان کی حکومت ختم کرنے کے لیے وہاں پر حملہ کر دیا۔ 11 ستمبر کے واقعہ سے مذہبی جنونی قوتیں جہاں ایک جانب ایسی قوت کے طور پر ابھر کر سامنے آئیں، جو بڑھ کر وار کر سکتی ہے اور دوسری جانب وہ امریکی سامراج کے حملے کے بعد مظلوم بھی بن گئے۔ مذہبی

جنونیت یا سامراج کا خاتمہ ایک یا دوسرے کو جسمانی طور پر ختم کرنے سے نہیں کیا جاسکتا۔ یہ سوچ ان عناصر کی تھی جنہوں نے ورلڈ ٹریڈ سنٹر گرایا اور یہی سوچ امریکی صدر جارج بش کی تھی جس نے افغانستان پر حملہ کیا۔ دونوں ایک دوسرے کو ختم کرنے میں کامیاب نہ ہوئے بلکہ جدلیاتی انداز میں دونوں نے ایک دوسرے کو مقبول ہونے میں مدد دی۔ اس طرح نہ چاہتے ہوئے بھی یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے کی سیاسی سوچ کے فروغ کا باعث بن گئیں۔ مگر اس سیاسی عمل میں سب سے زیادہ نقصان محنت کش عوام کا ہوا، جن کو حاصل مراعات اور سول لبرٹیز کو دہشت گردی کو ختم کرنے کے نام پر دونوں نے اپنے اپنے انداز میں ختم کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

11 ستمبر کے واقعہ نے دنیا کی سیاسی تاریخ میں رجعت پرستانہ دائیں بازو کے انتہائی خیالات کو فروغ دینے میں مدد دی ہے۔ اس نے مغرب میں عدم سیکورٹی کے نظریات کو فروغ دیا۔ جس کا حل کنزرویٹو پارٹیوں نے دہشت گردی، کے خلاف فیصلہ کن جنگ کرنے کو بتایا اور عوام کو وقتی طور پر یہ باور کرایا کہ دہشت گردی صرف اور صرف دہشت گردی اور جنگ سے ہی ختم کی جاسکتی ہے۔ جبکہ تیسری دنیا اور خاص طور پر مسلم ورلڈ میں مذہبی جنونی قوتوں کو اس طرح پیش کیا کہ یہ کچھ کر سکتی ہیں۔ سامراج دشمن جذبات کو سامراج کے بڑے ٹاورز گرتے دیکھ کر کافی حد تک وقتی اطمینان ملا اور یوں سامراج دشمن نظریات کو مذہبی جنونی اپنی طرف کھینچنے میں کافی حد تک کامیاب ہوئے۔ افغانستان میں طالبان حکومت کا ہتھیار نہ ڈالنا بھی، مذہبی جنونی قوتوں کی سیاسی طاقت کو سہارا دینے کا ایک باعث بنا ہے۔

1960-70ء کی دہائی میں تیسری دنیا میں سامراج مخالف جذبات کی سیاسی نشان دہی جمال ناصر، ذوالفقار بھٹو، سوئکارنو اور بن بیلا وغیرہ کی صورتوں میں نظر آتی ہے۔ یہ افراد سرمایہ دار سیاست دانوں کے مقبول عام چہرے تھے جو سامراج مخالف جذبات کو اپنی سیاسی حمایت کی شکل دینے میں کامیاب ہوئے۔ 80 کی دہائی میں سوویت یونین اور دیگر سٹالنیسٹ ریاستوں کی توڑ پھوڑ نے بورژوا مقبول عام سیاست دانوں کے سحر کو توڑ دیا۔ 90 کی دہائی ان قوتوں کے

رائیٹ ونگ ٹرن لینے اور سامراج کی حتمی فتح کے نظریات پھیلانے والوں کی کنفیوژن کی دہائی قرار دی جاسکتی ہے۔ لیفٹ رائیٹ ہوگیا۔ جبکہ نیا لیفٹ پرانے لیفٹ کی جگہ نہ لے سکا۔ جب رجحان ہی رائیٹ ونگ ٹرن رہا ہو تو پھر رائیٹ کی مقبولیت کے ہی امکانات ہوسکتے ہیں۔ اکا دکا واقعات کو چھوڑ کر، 90 کی دہائی کے آخر میں بالاخر کسی حد تک، سابقہ لیفٹ، گلوبلائزیشن کے خلاف ایک سماجی تحریک چلانے میں کامیاب ہوا۔ سامراجی گلوبلائزیشن کے خلاف تحریک کا عروج ابھی آنا تھا کہ 11 ستمبر کا واقعہ ہوگیا جس نے سیاست کی برج ہی الٹا دی اور تاریخ کا پہیہ وقتی طور پر الٹ چلنا شروع ہوگیا۔ افغانستان میں طالبان کی حکومت کے خاتمے کے وقت جو وحشیانہ بمباری کی گئی اس نے افغانستان میں تو مذہبی جنونیوں کو زیر زمین جانے پر مجبور کر دیا مگر پاکستان میں ان عناصر کو ایک نئی سیاسی زندگی بخش دی۔ اس کا زیادہ اثر ان علاقوں پر ہوا جو افغانستان کے ساتھ تھے۔ افغانستان کی مشرقی اور شمالی سرحدوں میں پختون قومیت نے بھی اس میں مداخلت کی جبکہ افغانستان کی مغربی اور جنوبی سرحدیں پہلے ہی طالبان کے کنٹرول میں نہ تھیں بلکہ وہ شمالی اتحاد کے کنٹرول میں تھیں۔ جو بذات خود ایک ایسی مذہبی جنونی قوت ہے جو ابھی تک سامراجی پشت پناہی میں کھلے بندوں کام کرنے میں اپنی عافیت سمجھتی ہے۔

پاکستان کے اندرونی حالات

پاکستان کے اندر بھی وہ تمام تر معروضی حالات تھے جن کی وجہ سے مذہبی جنونیت کا زہر تیزی سے پھیلا۔ 1970ء کی دہائی میں ریفارمسٹ بھٹو ایک رجعتی ماس موومنٹ کے ہاتھوں 1977ء میں فارغ ہوا۔ بھٹو، وینزویلا کے ہوگو شاویز کی طرح نہ تھا جس نے اپنے خلاف عوامی تحریک کا مقابلہ عوامی تحریک سے کرنے کی تدبیر اختیار کی۔ بھٹو نے تو مذہبی غلبہ والے قومی اتحاد کے ساتھ ہر ممکن مصالحت کی کوشش کی۔ شراب پر پابندی، جمعہ کی چھٹی، اسی مصالحت کا نتیجہ ہے۔ بھٹو جتنا رائیٹ کی طرف گیا، رائیٹ اتنا ہی مضبوط ہوا۔ قومی اتحاد کی 1977ء کی تحریک ایک رجعتی تحریک تھی جس کا نتیجہ جولائی 77 میں ضیاء الحق کے مارشل لاء کی صورت نکلا۔ 77 سے

88 تک ضیاءالحق کے مارشل لاء اور نیم سول حکومتیں رجعتی قوتوں کے فروغ میں دلچسپی لیتی رہیں۔ وہ ایک ایسے جن کو وقتی مفادات کے لیے پالتے رہے جو ان کے کنٹرول سے بھی باہر ہوگیا۔ 1988ء سے 1999ء تک تمام سول حکومتوں کے دور میں عوام کا کوئی بنیادی مسئلہ حل نہ ہوا اور عوام کی ایک بڑی تعداد ان سے متنفر ہوتی گئی۔ تیسری قوت کا نظریہ تیزی سے ہر ذہن کی کسی نہ کسی تہہ میں جگہ پا گیا۔ 1988ء سے 99ء تک ہر سرمایہ دار حکومت اپنے اقتدار کے متوقع پانچ سال پورے نہ کرسکی اور اسے وقت سے پہلے ہی رخصت ہونا پڑا۔ رخصتی کے وقت ریاستی پشت پناہی سے مذہبی جنونی قوتیں مخالفانہ عوامی تحریک کا جواز پیش کرتی رہیں۔ ہر حکومت کے جانے کے وقت جماعت اسلامی کوئی نہ کوئی تحریک چلانے میں مصروف نظر آتی رہی۔

اپنی آزادانہ سیاسی قوت کو بڑھانے کے لیے مذہبی سیاسی جماعتوں نے 1990ء کے بعد سے بورژوا سیاسی پارٹیوں کے ساتھ انتخابی الائنس بنانے کو ترجیح نہ دی۔ اس سے پہلے ہر انتخاب یا تحریک کے موقع پر مذہبی جماعتیں، رائیٹ ونگ کنزرویٹو بورژوا سیاست دانوں کے ساتھ ملنے میں اپنی عافیت سمجھتے رہے۔ وہ اس وقت اپنے آپ کو سیاسی طور پر اتنا مضبوط نہ سمجھتے تھے کہ وہ آزادانہ طور پر سامنے آتے۔ 1993ء میں جماعت اسلامی نے اسلامک فرنٹ بنا کر اپنی آزادانہ سیاست کی بنیاد رکھی۔ اس کو توقع کے مطابق انتہائی کم ووٹ ملے۔ 1997ء میں بائیکاٹ کیا گیا۔ 1999ء کی ملٹری بغاوت کو مذہبی جنونی قوتوں نے خوش آمدید کہا۔ لیکن ماضی کے برعکس وہ فوجی حکومت کا حصہ نہ بنیں۔ فوجی پشت پناہی کی وجہ سے ہی، 2000ء میں، انہوں نے امریکی صدر بل کلنٹن کو پاکستان آنے پر ''مہمان کی آمد'' قرار دیا۔ فوج سے ان کے اندرون خانہ رابطے چلتے رہے مگر 2001ء نے یہ سب کچھ بدل دیا۔

فوجی حکومت نے مذہبی جنونی عناصر کی بُش انتظامیہ کے اصرار پر کھلے بندوں حمایت کرنا چھوڑ دیا تو ان کی آزادانہ سامراج دشمن شناخت کے خدوخال اور بہتر ہوگئے۔ مذہبی جنونیت کے حالیہ فروغ میں ریاستی پشت پناہی، سرمایہ دارانہ پارٹیوں کا سیاسی دیوالیہ پن، عالمی سامراج

کے وحشیانہ جنگی جنون، جیسے عناصر کا مختلف انداز میں مختلف سطح پر اثر انداز ہونا شامل ہے۔ جس طرح ماضی میں نواز شریف کی مسلم لیگ کو ریاستی پشت پناہی سے بنایا گیا مگر وہ بعد ازاں خود ایک آزاد قوت کی صورت میں بھی نظر آیا۔ جس طرح ماضی میں ایم کیو ایم کو ریاستی پشت پناہی میں بنایا گیا وہ بعد ازاں اپنی آزادانہ حیثیت میں ریاست سے ٹکراؤ کی کیفیت میں وقتی طور پر چلے گئے، کچھ اسی انداز میں مذہبی جنونی قوتیں ریاستی عناصر کی مدد سے اپنی قوت کو بڑھاتی رہیں مگر اب ایک آزاد حیثیت میں ایک سیاسی قوت کے طور پر ایک متبادل طاقت کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ کیا وہ مزید Grow کریں گے؟ عالمی اور قومی سطح پر اگر نظر ڈالی جائے تو ان کے grow کرنے کے امکانات مزید نظر آ رہے ہیں۔ ان کی تمام آنکھیں پنجاب اور سندھ پر ہیں۔ وہ انتہائی چالاکی ہوشیاری سے اپنی قوتوں کو روز بروز ایک متبادل قوت کے طور پر پیش کرنے میں کامیاب نظر آ رہے ہیں۔ مسلم لیگ نواز گروپ نے شعوری طور پر مذہبی جنونیت کے فروغ میں ایک کردار ادا کیا ہے۔ اگرچہ وہ اپنے طور پر چالاکی سے کام لے رہے تھے کہ شاید مذہبی جنون ان کے حریف مسلم لیگ قائداعظم اور فوجی حکمرانوں کو مشکل وقت دیں گے۔ مگر جو بھیڑیا وہ پال رہے ہیں وہ سب سے پہلے مسلم لیگ نواز کو ہی نگلے گا۔ مذہبی جنونی قوتوں کے فروغ پانے میں ان کی حکمت عملی کا بڑا ہاتھ ہے۔ بورژوا سیاست دان مذہبی جماعتوں پر ہمیشہ یہ الزام لگاتے تھے کہ یہ متحد نہیں اور جو ایک دوسرے کے پیچھے نماز نہیں پڑھ سکتے، وہ سیاسی قیادت کیا دیں گے؟ مذہبی جنونی قوتیں، متحدہ مجلس عمل میں متحد بھی ہو گئیں اور ایک دوسرے کے پیچھے نماز بھی پڑھ لی۔ مذہبی جماعتوں کے اتحاد کی حکمت عملی نے بھی ان کے فروغ میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

مذہبی قوتوں کے فروغ میں عالمی حالات مزید مددگار ہو سکتے ہیں۔ اگر امریکہ عراق پر حملہ کرتا ہے جس کے امکانات موجود ہیں تو ان قوتوں کی طاقت اور بڑھ سکتی ہے اور جنونیت کا ایک نیا دور سامنے آ سکتا ہے۔ عراق پر حملہ افغانستان پر حملہ کے مترادف نہیں ہے۔ افغانستان پر حملے کے وقت امریکی سامراج کو سامراجی ممالک میں کسی حد تک بڑی عوامی حمایت حاصل تھی کیونکہ

امریکہ پر تازہ تازہ حملہ ہوا تھا۔ مگر عراق پر سامراجی حملہ سے قبل ہی یہ بات صاف نظر آ چکی ہے کہ اس پر حملہ صرف اور صرف تیل کے لیے کیا جا رہا ہے۔ اور ایک زیادتی ہو رہی ہے۔ اس زیادتی کے خلاف عام شہریوں میں خاصہ ردعمل ہے اور ان جذبات کا زیادہ تر فائدہ مذہبی جنونی عناصر اٹھا سکتے ہیں۔

ایسا نظر آ رہا ہے کہ مذہبی جنونی قوتیں سرحد اور بلوچستان کے بعد پنجاب اور سرحد میں بھی 15 سے 20 فیصد تک عوامی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہیں۔ شمالی پنجاب میں خاص طور پر شائد ہی ایسا کوئی گاؤں یا قصبہ ہو جہاں ان کے شہید نہ ہوں۔ نوجوانوں کی ایک بڑی کھیپ افغانستان یا کشمیر میں جہاد کے نام اپنی پر زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھی ہے۔ ان نوجوانوں اور ان کے رشتہ داروں کی تمام تر ہمدردیوں کا فائدہ بھی مذہبی جنونی قوتیں اٹھا رہی ہیں مذہبی جنونی قوتوں کے بڑھتے ہوئے اثر کی ایک غمازی اینٹی عراق وار مظاہروں سے بھی نظر آتی ہے۔ پاکستان میں ان کی قیادت مذہبی جنونی قوتوں کے ہاتھ میں ہے اور زیادہ تر مظاہرے ان جماعتوں کی طرف سے ہی منظم کیے جا رہے ہیں۔

☆☆☆

انتہا پسندوں کے الفاظ اور اعمال میں تضاد

ذاتی آزادی اور آزادی اظہار پر پابندی سے ایک مسئلہ نئی اور تخلیقی سوچ کے پروان نہ چڑھنے کا ہے

رضوان عطا (جولائی 2003ء)

جمہوریت، آزادی اور امن جیسے الفاظ امریکی صدر بش کی کسی بھی جنگی کارروائی کرنے سے پہلے تقاریر اور بیانات کا حصہ ہوتے ہیں لیکن پھر بھی دنیا میں لوگوں کی اکثریت صدر بش کی زبان پر اعتماد نہیں کرتی۔ اس کی وجہ بلکل واضح ہے۔ افغانستان ہو یا عراق، انہیں خوبصورت الفاظ کو استعمال میں لاتے ہوئے جمہوریت، آزادی اور امن کی نفی کی جاتی ہے۔ عراق کی مثال کو لیں، فوج کے ذریعے قبضے کو آزادی کہا جا رہا ہے۔ امریکی میڈیا میں اپنے شہریوں کو باور کرانے کے لیے یہی بار بار کہا گیا۔ پس الفاظ اس حوالے سے کوئی اہمیت نہیں رکھتے اگر اعمال اور ان اعمال کے محرکات کچھ اور ہوں۔

پاکستان میں جمہوریت اور پارلیمنٹ کی بالادستی اور پھر ایک صوبے میں ''عریانیت فحاشی'' خاتمہ کے لیے ایم ایم اے کی حکومت زور وشور سے ''اقدامات'' کر رہی ہے۔ سائن بورڈ توڑے جا رہے ہیں، سکولوں میں پینٹ پہننے والے بچوں کو صوبائی حکومت شلوار قمیض پہنانا چاہتی ہے۔ کسی خاتون کی تصویر نہیں ہونی چاہئے، یہ ان کے نصب العین کا ایک حصہ ہے۔ حکومت کے تحت ایک ایسی ''ملیشیاء'' بنائی جا رہی ہے جو ''انصاف'' فراہم کرے گی.....اور موقع پر۔ اور پھر اسے کسی عدالت میں چیلنج بھی نہیں کیا جا سکے گا۔ اس طریقہ کار میں کسی ''غیر اسلامی'' کام پر

تشدد کو بطور ہتھیار استعمال کرنا بھی ان کے مطابق غیر مناسب نہیں، عین مناسب ہوگا۔

اگر اسی طریقہ کار کو اپنایا جائے اور مذہبی جماعتوں کے اتحاد کی منطق کو سامنے رکھا جائے تو ان کی حکومت کے کسی اقدام کی مخالفت بھی ایک ''جرم'' ہوسکتا ہے کیونکہ صوبائی حکومت جو اقدامات کر رہی ہے وہ ان کے مطابق خود نہیں کر رہی بلکہ وہ ایک ذریعہ ہے۔ مذہبی احکامات کو لاگو کرانے کا اس لیے اس ذریعے کو روکنا، دراصل مذہبی احکامات کی راہ میں رکاوٹ ڈالنا ہے، جس کی ہرگز اجازت نہیں دی جاسکتی۔

ان کے مطابق خواتین کو صرف گھروں میں رہنا چاہیے، امور مملکت چلانا ان کے نہ تو بس کی بات ہے اور نہ ہی انہیں یہ اجازت دی جاسکتی ہے۔ عورت کی حکمرانی قبول نہیں۔ خواتین کے سائن بورڈ پر رنگ پھینکے جا رہے ہیں۔ یہ سائن بورڈ زیادہ تر ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ہیں جس میں خواتین ماڈلز کی بڑی بڑی تصاویر آویزاں ہیں۔ جماعت اسلامی کے قاضی حسین احمد نے ان واقعات کی وکالت کرتے ہوئے پریس کلب لاہور میں ایک کتاب کی تقریب رونمائی میں خطاب کے دوران کہا کہ ہم نے وہی کام کیا جس کا مطالبہ حقوق نسواں کی تحریک کرتی آرہی ہے۔ (ان کی مراد یہ تھی کہ عورت کو نمائشی شے کے طور پر نہ پیش کیا جائے)۔ یہ سادہ منطق اتنی سادہ نہیں۔ حقوق نسواں کی تحریک کا یہ مطالبہ کہ خواتین کو commodity نہ بنایا جائے، انہیں مساوی حقوق دینے کے لیے ہے۔ جبکہ مذہبی جماعتیں انہیں گھروں تک محدود کرنے کے لیے یہ اعمال سرانجام دے رہی ہیں۔

ملکی سطح پر کامیابی کی صورت میں ایم ایم اے کی ملک میں پارلیمنٹ کی بالادستی اور جمہوریت کے لیے لڑی جانے والی جنگ کی عملی شکل وہی ہوگی، جس کی ابتدائی جھلک صوبہ سرحد میں نظر آرہی ہے۔ ایم ایم اے جمہوریت کی جس شکل کو لانا چاہ رہی ہے وہ تھیوکریسی ہے، جس پر جمہوریت کے لفظ کا لبادہ اوڑھا گیا ہے۔ جس سے آزادی رائے اور ذاتی آزادی کا دائرہ تنگ ہوجاتا ہے۔

عوام پر آزادی رائے اور ذاتی آزادی کے راستے بند کرنے سے بہت پیچیدہ مسائل پیدا ہوتے ہیں جو تشدد اور ہلاکتوں کو جنم دیتے ہیں۔ مثلاً سعودی عرب میں پچھلی کئی دھائیوں سے بادشاہت اور تھیوکریسی کا راج ہے۔ بادشاہت نے اپنے اقتدار کے لیے جس چیز کا سہارا لیا، وہی

اس کے لیے اب مسائل پیدا کر رہی ہے۔ وہاں پڑھے لکھے نوجوانوں کی بہت بڑی تعداد امریکی پالیسیوں کی مخالف ہے اور اس کا جواب دہشت گردی کے طریقوں سے دینے والوں کو اچھا سمجھتی ہے۔ ان کے ہاں اسامہ کی مقبولیت ہے۔ کیونکہ اتنے بڑے عرصے میں وہاں پر کسی دوسرے نقطۂ نظر کو پروان چڑھنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ صرف ایک نقطۂ نظر کی حکمرانی رہی اور آج وہاں پر مسلسل دہشت گردی کی کارروائیاں ہو رہی ہیں۔

ذاتی آزادی اور آزادی اظہار پر پابندی سے ایک مسئلہ نئی اور تخلیقی سوچ کے پروان نہ چڑھنے کا ہے۔ اس حوالے سے پنجاب یونیورسٹی ایک اچھی مثال ہے۔ یونیورسٹی لاہور شہر میں ایک ایسا جزیرہ ہے، جہاں طلباء کی ایک مخصوص مذہبی تنظیم کی اجازت کے بغیر کوئی سرگرمی نہیں ہو سکتی، نہ سیمینار، نہ میٹنگ، نہ مباحثہ! یہاں تک کہ مریضوں کے لیے خون اکٹھا کرنے کا کوئی فورم بھی نہیں بن سکتا۔ اسی لیے جب یونیورسٹی میں سال میں ایک مرتبہ یہی تنظیم کتاب میلہ کراتی ہے تو اس میں پنجاب یونیورسٹی کے طلباء کو تخلیقی کتب نہیں ملتیں، کیونکہ کسی دوسرے نقطۂ نظر کو پہننے اور قائم رکھنے کا موقع ہی نہیں دیا جاتا۔ یونیورسٹی میں خفیہ تشدد کی تاریخ کئی برس پرانی ہے اور اس کے طلباء کی ذہنی نشوونما کو شدید متاثر کیا ہوا ہے۔ ایک طالب علم کسی طالبہ سے بات نہیں کر سکتا اور اس طرح یونیورسٹی کی آبادیاں دو حصوں میں تقسیم ہے، جن کے تجربات کا تبادلہ نہیں ہوتا۔ ترقی پسند سوچ رکھنے والے طلباء اور اساتذہ کو حراساں کیا جانا ایک معمول ہے جس کی داستانیں کئی مرتبہ ملکی پریس میں آ چکی ہیں۔

ایم ایم اے کی حکومت صوبہ سرحد میں جس قسم کے اقدامات کر رہی ہے، وہ سماجی سطح پر ایسی تبدیلیاں لائے گی، جو معاشرے کو اقتصادی، سماجی اور سیاسی سطح پر مزید پسماندہ کریں گی۔ اس طرح معاشرے میں ایسے رجحانات کو تقویت ملے گی، جو تشدد کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں اور اس طرح انارکی اپنی مزید جگہ بنائے گی۔

اسی لیے ایسی سیاسی قوتیں جو خوبصورت الفاظ کو استعمال کرتے ہوئے ایک طرف اپنے عمل میں اس کی نفی کرتی ہیں اور دوسری طرف انہیں اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتی ہیں، امن کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ وہ چاہے عالمی سطح پر ہوں یا مقامی سطح پر۔

☆☆☆

سانحہ کوئٹہ

مذہبی سیاسی جماعتوں کا فروغ فرقہ واریت کو ہوا دینے کی زرخیز زمین

فاروق طارق (جولائی 2003ء)

3 جولائی 2003ء کو کوئٹہ کی ایک امام بارگاہ میں بعض مذہبی دہشت گردوں کی فائرنگ سے کم از کم 50 افراد ہلاک ہو گئے اور درجنوں زخمی ہوئے۔ ہلاک ہونے والے اکثر افراد کا تعلق ہزارہ برادری کی شیعہ کمیونٹی سے تھا۔ اس اندوھناک واقعہ کے ردعمل میں شہر میں نوجوانوں نے بعض گاڑیوں کو آگ لگا دی۔ مقامی حکومت نے فوری طور پر رینجرز اور فوج کو طلب کر کے کرفیو نافذ کر دیا۔

یہ واقعہ اس روز ہوا، جب ملک بھر میں متحدہ مجلس عمل نے سرحد سے تعلق رکھنے والے ایک ایم این اے کی نشست کی منسوخی کے خلاف احتجاج کی کال دی ہوئی تھی۔ پشاور ہائی کورٹ نے قومی اسمبلی کی نشست اس لیے منسوخ کر دی کہ اس کے پاس ایک مذہبی ادارے کی ڈگری تھی۔ اس نشست پر مسلم لیگ کے افتخار گیلانی نے اس کی نشست کینسل کرنے کے لیے انتخابی عذر داری دائر کی ہوئی تھی۔ ملک بھر میں متحدہ مجلس عمل کی احتجاج کی کال پر وہ اثر نہ ہوا، جس کی وہ توقع کر رہے تھے۔

کوئٹہ میں مذہبی فرقہ وارانہ دہشت گردی کا یہ دوسرا واقعہ ہے اس سے قبل 7 جون

2003ء کو شیعہ کمیونٹی سے تعلق رکھنے والے ہزارہ برادری کے 11 زیر تربیت پولیس افسران کو گولیاں مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ ان واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے متحدہ مجلس عمل کے صدر مولانا فضل الرحمان نے کہا کہ ان واقعات کو مذہبی فرقہ واریت سے تعبیر کرنا غلط ہوگا۔ جبکہ جنرل پرویز مشرف اور وزیر اعظم جمالی ان واقعات پر ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے اسے غیر ملکی عناصر کی کارستانی قرار دے رہے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ دہشت گردی سے نمٹنے کی بات بھی کر رہے ہیں۔

جن مذہبی دہشت گردوں سے حکومت سختی سے نمٹنے کی بات کر رہی ہے۔ وہ خودکش دھماکوں سے روزانہ کام لیتے ہیں۔ اپنی جان دے کر دوسروں کی جان لینا ان کی فلاسفی کا حصہ ہے، ان سے آہنی ہاتھ سے نمٹنے کی بات صرف اور صرف عوام کو خاموش کرانے کی بات ہے۔

آخر بلوچستان میں یہ فرقہ واریت دوبارہ کیوں ابھری ہے؟ کیا یہ حکومت کی سازش ہے کہ متحدہ مجلس عمل کو فرقہ وارانہ بنیادوں پر تقسیم کر دیا جائے؟ کیا یہ جہادی عناصر کی کارستانی ہے؟

اس واقعہ پر مختلف قیاس آرائیاں کی جا رہی ہیں اور ہر طرح کے نتیجے نکالے جا رہے ہیں۔ مگر ہمیں اس واقعہ کے سیاسی پس منظر اور اس میں شامل مختلف سیاسی رجحانات کو دیکھتے ہوئے اس کا جائزہ لینا ہے اور اس سے سیاسی اسباق سیکھنے ہیں۔

کوئٹہ کا واقعہ اس جگہ ہوا جہاں پر مذہبی بنیادوں پر ایک سیاسی اتحاد، متحدہ مجلس عمل، مسلم لیگ (ق) کے ساتھ الائنس میں شامل ہو کر حکومت کر رہا ہے۔ اس طرح سرحد میں بھی متحدہ مجلس عمل کی حکومت ہے۔ سرحد میں پچھلے عرصہ میں مذہبی حکومت نے اپنے مذہبی انتہا پسند ہونے کا ثبوت دینے کے لیے شریعت بل پیش کیا۔ صوبہ میں جہاں جہاں ہورڈنگ بورڈز لگے ہوئے تھے ان کو اتار پھینکا، سینما ہاؤس پر حملے کیے۔ کیبل نیٹ ورک بند کرا دیا گیا اور سماجی تنظیموں کو دھمکیاں دیں۔

سرحد اور بلوچستان میں مذہبی قوتوں کی حکومت بننے کے عمل کے ساتھ ہی افغانستان میں بھی امریکی و افغانی فوجی سپاہیوں پر حملوں میں تیزی آ گئی اور روزانہ ہی کسی نہ کسی جگہ حملے ہونے لگے۔ امریکی و برطانوی فوجوں کی اموات کی خبریں جگہ جگہ آنے لگیں۔ اس طرح ایران

میں مذہبی حکومت کو ختم کرنے کے لیے امریکی سامراج نے وہاں پر طلباء مظاہروں کو شہ دینی شروع کر دی اور مذہبی حکومت بھی براہ راست پریشر میں آ گئی۔

☆ ایران میں شیعہ حکومت کو سامراج سے دھمکیوں کے بعد بلوچستان میں شیعہ کمیونٹی پر بار بار حملے کوئی علیحدہ علیحدہ واقعات نہیں بلکہ ایک دوسرے سے جڑے واقعات ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک مذہبی فضا بنی ہو اور مذہبی فرقہ وارانہ بنیادوں پر لڑائی جھگڑے نہ ہوں۔ اس کی ہر جگہ مثالیں موجود ہیں۔

☆ بھارت میں مذہبی شاونزم کی بنیاد پر بھارتیا جنتا پارٹی کی حکومت آئی تو وہاں پر مذہبی اقلیتوں پر حملوں میں تیزی آ گئی اور پھر وہاں پر گجرات میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔

☆ اسرائیل میں ایک مذہبی شاونسٹ صیہونی حکومت قائم ہے اور وہاں پر مسلسل فلسطینی عوام پر حملے ہو رہے ہیں، فلسطینی علاقوں پر قبضہ جاری ہے اور ان کے گھروں کو جہازوں اور ہیلی کاپٹروں کے ذریعے تباہ کیا جا رہا ہے۔

☆ افغانستان میں ایک مذہبی حکومت طالبان کی قائم ہونے کے بعد قتل و غارت اور جبر کے واقعات میں اس قدر تیزی ہوئی تو ان کے دور حکومت میں مسلسل سول وار کی صورتحال پیدا ہو گئی۔

☆ ایران میں مذہبی حکومت کے قیام کے بعد 1979ء سے لیکر 1989ء تک عراق سے دس سالہ جنگ جاری رہی۔ اور بعد ازاں جبر کے ذریعے اپنے تمام مخالفین کو خاموش کرا دیا گیا۔

☆ پاکستان میں حکومت اور ریاست کے زیادہ سے زیادہ مذہبی ہونے کے نتیجے میں پچھلے 30 سالوں میں خاص طور پر مذہبی فرقہ واریت کے واقعات میں زبردست اضافہ ہوا۔

☆ آئرلینڈ میں بھی دو عیسائی مذہبی انتہا پسند گروپوں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کے درمیان عرصہ دراز سے ایک کشیدگی اور محاذ آرائی جاری ہے۔

کوئٹہ میں ہونے والے واقعات بھی اس جگہ ہوئے جہاں پر مذہبی قوتیں اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہی تھیں۔ مذہبی قوتیں آپس میں قتل و غارت پر کیوں یقین رکھتی ہیں، اس کی وجہ بہت واضح ہے۔ ایک خاص مذہبی فرقہ صرف اپنے سچے ہونے اور دوسرے کے غلط ہونے پر ہی انحصار کرتا ہے۔

اس فلسفہ پر عمل کرتے ہوئے مذہبی انتہا پسند دوسرے فرقہ کو صفحہ ہستی سے مٹانے کو اپنا بنیادی فریضہ سمجھتے ہیں۔ جس کے لیے وہ جان دینے کو بھی تیار رہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے انہیں خصوصی طور پر تیار کیا جاتا ہے، برین واشنگ کی جاتی ہے۔ ان کو اس قدر جنونی بنایا جاتا ہے کہ انسانی، اخلاقی اور دیگر اقدار اس کے سامنے ماند پڑ جاتی ہیں اور وہ جنون میں انسانی خون کو بہانا اپنا مذہبی فریضہ سمجھ لیتا ہے۔

اس کو اس جنون تک لے جانے والوں کی نیت کیا ہے؟ کیا وہ آئی ایس آئی کے لوگ ہیں؟ جو اس فلسفہ پر کام کر رہے ہیں کہ متحدہ مجلس عمل کو اس بنیاد پر تقسیم کیا جائے یا کوئی فعال گروہ ہے جو خود اس بات کو اپنا بنیادی مقصد سمجھتا ہے۔ یہ صورتحال واضح نہیں۔ لیکن جو بات واضح ہے وہ یہ کہ مشرف حکومت اور مذہبی جنونی قوتوں کے آپس میں دیرینہ تعلقات اب واضح طور پر ایک لڑائی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ مشرف حکومت یا اس کی ریاست کے کچھ حصے دور اقتدار کے فوری بعد سے ہی مذہبی قوتوں کو اپنی سودا بازی کے لیے ایک قوت کے طور پر اسے فروغ دیتے رہے ہیں۔ مگر اب اس سودے بازی کا وقت ختم ہو رہا ہے۔ وہ یہ سودا بازی یا درمیانی راستہ لمبا عرصہ نہیں چلا سکتے تھے۔ جنرل مشرف نے اپنے حالیہ دورہ امریکہ و یورپ کے دوران سامراجی قوتوں کو مذہبی جنونیت کے خلاف اقدامات اٹھانے کی بار بار یقین دہانی کرائی۔ اس واقعہ نے اسے موقع فراہم کر دیا کہ وہ مذہبی جنونی قوتوں کے خلاف گرفتاریوں کا سلسلہ تیز کر دے۔ جنرل مشرف نے اس واقعہ کو اپنے خلاف ایک سازش قرار دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ جنرل مشرف اور اس کی پیش رو فوجی و سیاسی حکومتیں مذہبی جنونی قوتوں کی ہر طرح سے مدد کرتی ہیں ان کو فروغ دیتی رہیں۔ امریکی سامراج بھی ان کی مدد کو آتا رہا۔ کمیونزم کو کفر سمجھ کر مذہبی جنونی قوتیں امریکی سامراج کے مفادات کو پورا کرنے کے لیے ''جہاد'' کرتی رہیں۔

اب یہ تمام تعلقات الٹ پلٹ رہے ہیں نئی دوستیاں اور نئے محاذ بن رہے ہیں۔ کل کے دوست آج ایک دوسرے کے دشمن بن رہے ہیں۔ یہ ان کے مفادات کی جنگ ہے۔

ہمیں جو واضح سبق اس تمام واقعات سے سیکھنا ہے وہ یہ کہ مذہبی فرقہ واریت کسی بھی مسئلے کا حل نہیں۔ نہ ہی مذہبی سیاسی جماعتیں عوام کے مسائل حل کر سکتی ہیں۔ ان کی بجائے طبقاتی بنیادوں پر عوام کو منظم کرنے کی ضرورت ہے۔

☆☆☆

اسلامی نظام کے نعرے ملائیت اور فرقہ واریت کا آغاز

زاہد چوہدری کی کتاب ''پاکستان کیسے بنا'' سے اقتباسات

- ''تمہارا مذہب، تمہاری ذات، تمہارا عقیدہ کچھ بھی ہو کاروبار مملکت کا اس سے کوئی تعلق نہیں'' محمد علی جناح (11 اگست 1994ء)

محمد علی جناح کی اس تاریخی تقریر کے خاتمہ پر ایوان کے سارے ارکان نے پرجوش تالیوں کے ذریعے اس کے نفس مضمون سے اتفاق کا اظہار کیا تھا اور کسی ایک رکن نے بھی اس تقریر کے کسی بھی حصے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

اس تقریر کے بعد ایوان نے ''بابائے قوم'' کے لیے عقیدت و تشکر کے اظہار کی غرض سے ایک قرارداد کے ذریعہ قائداعظم کا خطاب دیا۔

- ہیکٹر بولیتھو کے بیان کے مطابق وہ لندن میں لبرل پارٹی سے متاثر ہوئے تھے جو ان دنوں بلا امتیاز سارے شہریوں کے لیے مساوی سیاسی، معاشی اور معاشرتی حقوق کی علمبردار تھی۔ عالم اسلام میں ان کا ہیرو سعودی عرب کا ابن سعود نہیں تھا بلکہ ترکی کا مصطفیٰ کمال اتاترک تھا۔ جس نے اگست 1923ء میں ترکی کا صدر منتخب ہونے کے بعد فروری 1924ء میں خلافت اسلامیہ کے ادارے کو ختم کر دیا تھا اور قومی اسمبلی سے جو سیکولر آئین منظور کروایا تھا اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگر آئندہ کسی شخص یا جماعت کی جانب سے سیاسی مقاصد کے لیے مذہب کا استعمال ہوگا تو اسے قید و بند کی سخت سزا دی جائے گی۔

● جماعت اسلامی کے امین احسن اصلاحی جیسے ملاؤں کے دوسرے حلقے کا خیال یہ تھا کہ جو مملکت جناح کی 11 اگست کے نصب العین پر مبنی ہوگی وہ ''ابلیس کی مخلوق'' ہوگی اور خود جماعت اسلامی کے امیر مودودی کا فتویٰ یہ تھا کہ ''لیگ کے قائداعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے پرکھتا ہو۔ یہ لوگ مسلمان کے معنی و مفہوم اور اس کی مخصوص حیثیت کو بالکل نہیں جانتے''۔

● محمد علی جناح اور ان کے ہم خیال عناصر کی اس سیاسی بے چارگی و زبوں حالی سے ان ملاؤں نے فائدہ اٹھانے میں کوئی تاخیر نہ کی جنہوں نے مارچ 1940ء سے لے کر اگست 1947ء تک تحریک پاکستان کی سرتوڑ مخالفت کی تھی۔ ان ملاؤں میں ایک ملا ابوالاعلیٰ مودودی بھی تھا جس نے 1941ء میں لیگ کے مطالبہ پاکستان کی مخالفت کے لیے پٹھانکوٹ کے نزدیک ایک مسلمان زمیندار کی زیر سرپرستی قائم کردہ اپنی درسگاہ میں ''جماعت اسلامی'' کے نام سے ایک سیاسی تنظیم قائم کی تھی۔ جب 14 اگست 1947ء کے بعد مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا منظم طریقے سے قتل عام شروع ہوا تو اس شخص کو بھی اپنے حواریوں کے ہمراہ لاہور میں آ کر پناہ لینا پڑی تھی۔ جہاں اس نے تقریباً تین ماہ تک پاکستان کے بارے میں بالکل خاموشی اختیار کئے رکھی لیکن جب اکتوبر کے اواخر میں نوائے وقت اور اس کے ہم خیال عناصر نے کھل کر جناح اور ان کے سیکولر نظریہ سیاست کی مخالفت شروع کی تو اسے بھی مسئلہ پر اظہار خیال کی ہمت ہوئی اور اس نے بھی اپنی جماعت کے ترجمان ہفت روزہ ''کوثر'' کی 16 نومبر کی اشاعت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نعرہ لگا دیا۔ ''کوثر'' کا اعلان یہ تھا کہ ''ہم سے یہ بھی پوچھا جاتا ہے کہ تم لوگ جب تحریک کے ہمنوا نہیں تھے جس کے نتیجے میں پاکستان بنا ہے تو اب آخر ہمیں کیا حق پہنچتا ہے کہ اس پاکستان کی سر زمین میں پناہ لو۔ اس سوال کا جواب ہمارے پاس یہ ہے کہ ہاں فی الواقع ہماری حیثیت پاکستان میں پناہ گزینوں کی سی ہے اور اگرچہ ہم اس تحریک کو آج بھی صحیح نہیں سمجھتے جس کے نتیجے میں پاکستان بنا ہے اور پاکستان کا اجتماعی نظام جن اصولوں پر قائم ہو رہا ہے ان اصولوں کو اسلامی نقطۂ نظر سے ہم کسی قدر و قیمت کا مستحق نہیں سمجھتے۔ لیکن جو چیز ہمیں یہاں کھینچ لائی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کے باشندے اعمال و کردار کے لحاظ سے چاہے کوئی بھی رویہ رکھتے ہیں۔ لیکن بہرحال وہ اس خدا کا نام

لیتے ہیں جس کی عبادت واطاعت ہماری نگاہ میں واجب ہے۔ وہ اپنے آپ کو اسی نبیؐ سے نسبت دیتے ہیں جس کی اسوہ کا اتباع ہماری نظر میں لازمہ اسلام ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس کتاب کا حامل مانتے ہیں جس کے ایک ایک شوشہ کی پابندی مسلمان کے لیے فرض عین ہے اور وہ اس اسلامی نظام کے قیام کی خواہش ظاہر کرتے ہیں جس کے سوا کسی دوسرے نظام کو قائم یا قبول کرنا روا نہیں ہے۔

- چونکہ افتخار الدین جہاں جاتا تھا اس کے پبلک جلسوں میں بہت سے لوگ شریک ہو کر اس کی سکیم کی پرجوش تائید وحمایت کرتے تھے۔ اس لئے مفاد پرست جاگیرداروں اور ان کے زرخرید ملاؤں کے حلقوں میں تہلکہ مچ گیا۔ ہر طرف سے شور برپا ہوا کہ افتخار الدین کمیونسٹ ہے اور اسلام دشمن ہے۔ یہ متروکہ زرعی اراضی اور کارخانوں کو قومی ملکیت میں لینے کا پرچار کرتا ہے حالانکہ اسلام کی رو سے نجی ملکیت پر کوئی حد مقرر نہیں کی جاسکتی۔ زمینداروں کے اخبار ایسٹرن ٹائمز نے نومبر اور دسمبر 1947ء میں احمد شفیع، پیر تاج الدین اور بعض دوسرے افراد کے کئی مضامین اور اداریے شائع کئے جس میں یہ الزام عائد کیا گیا کہ افتخار الدین جو کچھ کہتا ہے وہ غیر اسلامی ہے اور اسے خداداد مملکت پاکستان میں اشتراکیت کا پراپیگنڈا کرنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔
- ملا مودودی معاشی امور میں اسلامی مساوات کا قائل نہیں تھا۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ ''خدا کی بنائی ہوئی فطرت خود اس بات کی متقاضی ہے کہ انسانوں کے درمیان رزق میں تفاوت ہو لہٰذا وہ تمام تدبیریں اسلامی نقطہ نظر سے مقصد اور اصول میں غلط ہیں جو انسانوں کے درمیان ایک مصنوعی معاشی مساوات قائم کرنے کے لیے اختیار کی جائیں۔ اسلام جس مساوات کا قائل ہے، وہ رزق میں مساوات نہیں بلکہ حصول رزق کی جدوجہد کے مواقع میں مساوات ہے۔ فطرت سے قریب تر نظام وہی ہوسکتا ہے جس میں ہر شخص معیشت کے میدان میں اپنی دوڑ کی ابتدا اسی مقام اور اسی حالت سے کرے جس پر خدا نے اسے پیدا کیا ہے..... فطرت سے قریب تر نظام صرف وہی ہوسکتا ہے جس میں ہر شخص معیشت کے میدان میں اپنی دوڑ کی ابتداء اسی مقام اور اسی حالت سے کرے جس پر خدا نے اسے پیدا کیا ہے، جو موٹر لئے ہوئے آیا ہے وہ موٹر ہی پر چلے، جو صرف دو پاؤں لایا ہے، وہ پیدل ہی چلے اور جو لنگڑا پیدا ہوا ہے وہ لنگڑا کر ہی چلے۔ سوسائٹی کا قانون نہ تو ایسا ہونا چاہیے کہ وہ موٹر والے کا

مستقل اجارہ موٹر پر قائم کر دے اور لنگڑے کے لئے موٹر کا حصول ناممکن بنا دے اور نہ ایسا ہی ہونا چاہیے کہ سب کی دوڑ زبردستی ایک ہی مقام اور ایک ہی حالت سے شروع ہو اور آگے تک انہیں لازماً ایک دوسرے کے ساتھ باندھ رکھا جائے..... اسلام تمام دوسری ملکیتوں کی طرح زمین پر انسان کی شخصی ملکیت تسلیم کرتا ہے۔ جتنی قانونی شکلیں ایک چیز پر کسی شخص کی ملکیت قائم و ثابت ہونے کے لیے مقرر ہیں ان ساری شکلوں کے مطابق زمین بھی اسی طرح ایک آدمی کی ملکیت ہو سکتی ہے جس طرح کوئی دوسری چیز۔ اس کے لیے کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ ایک گز مربع سے لے کر ہزار ہا مربع ایکڑ تک خواہ کتنی ہی زمین ہو، اگر کسی قانونی صورت سے آدمی کی ملک میں آئی ہے تو بہر حال وہ اس کی جائز ملکیت ہے۔ اس کے لیے خود کاشت کرنے کی قید بھی نہیں ہے۔

- ''جس طرح مکان اور فرنیچر کرائے پر دیا جا سکتا ہے اور تجارت میں شرکت کی جا سکتی ہے اسی طرح زمین بھی کرائے پر دی جا سکتی ہے اور اس میں بھی شرکت کے اصول پر زراعت ہو سکتی ہے۔ بلا کرایہ کوئی شخص کسی کو دے یا بٹائی لئے بغیر کسی کو اپنی زمین میں کاشت کر لینے دے تو یہ صدقہ ہے مگر کرایہ ولگان یا بٹائی پر معاملہ طے کرنا ایسے ہی ایک جائز فعل ہے جیسے تجارت میں حصہ داری یا کسی دوسری چیز کو کرایہ پر دینا..... جو نظام زندگی انسان کی انفرادیت کو عزیز رکھتا ہو اور انسانی شخصیت کے ابھار کو مقصدی اہمیت دیتا ہو اس کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ اجتماعی فلاح کی ایسی تمام اسکیموں کو اصولی طور پر قطعی و حتمی طور پر رد کر دے جن پر یہ تجویز کیا گیا ہو کہ زمینوں اور کارخانوں اور تجارتوں کو قومی ملکیت بنا لیا جائے یا ان پر ریاست کا نازیانہ تسلط قائم کر کے ایک مرکزی منصوبہ بندی کے تحت ساری معیشت کی مشین گھمانی شروع کر دی جائے''۔ (مولانا مودودی)

- افتخار الدین نے صوبہ میں زرعی زمین کو قومیانے کی کبھی کوئی تجویز پیش نہیں کی تھی۔ اس نے تو محض مہاجر کسانوں کے لیے زمینداروں سے چند رعایات کا مطالبہ کیا تھا۔ مگر پنجابی جاگیردار اس سلسلے میں اس قدر بے رحم اور سنگدل تھے کہ انہوں نے اس بنا پر نہ صرف صوبے کے طول و عرض میں اشتراکی خطرے کی گھنٹیاں بجا دی تھیں بلکہ اس خطرے کے سدباب کے لیے

انہوں نے رجعت پسند ملاؤں اور موقع پرست اخبار نویسوں کی خدمات حاصل کرنے کے علاوہ جماعت اسلامی اور مجلس احرار جیسی پاکستان دشمن تنظیموں سے بھی گٹھ جوڑ کر لیا تھا۔

- اس مہم کی ابتداء دراصل 21 اکتوبر 1947ء کو ہوئی تھی جبکہ صوبائی مسلم لیگ کونسل نے ایک قرارداد میں مطالبہ کیا تھا کہ پاکستان میں ایک ایسا سوشلسٹ آئین مرتب کیا جائے جس کے تحت وفاق کے صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل ہوں۔
- مولانا مودودی کے فرمودات جن کا وہ قیام پاکستان سے پہلے پٹھانکوٹ کے نزدیک اپنے دارالسلام سے چرچا کیا کرتا تھا۔ وہ وطنی قومیت کے خلاف تھا اور جغرافیائی حدود سے بالاتر مسلم قومیت کے نظریے کی تبلیغ کرتا تھا۔ وہ تحریک پاکستان کو غیر اسلامی تحریک قرار دیتا تھا۔ اس کی رائے یہ تھی کہ ہندوستان کے مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان ہی نہیں ہیں اس لئے کوئی تحریک اور کوئی جماعت اس کی ہمدردی کی مستحق نہیں ہے۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ یہ لوگ از سر نو مسلمان بنیں تو اس کی امداد کے مستحق ٹھہریں گے ورنہ اس کو ان سے کوئی ہمدردی نہیں نہ ان سے وہ کوئی سروکار رکھنا چاہتا ہے۔
- اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں ایک بے دین قوم کی حیثیت سے اپنا علیحدہ وجود برقرار رکھا بھی (جیسا کہ ترکی اور ایران میں برقرار رکھے ہوئے ہیں) تو ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے؟ ہیرے نے اگر اپنی جوہریت ہی کھو دی تو پھر جوہری کو اس سے کیا دلچسپی کہ وہ کمبخت پتھر کی صورت میں باقی رہے یا منتشر ہو کر خاک میں رل مل جائے۔
- مسلم لیگ کے ریزولیوشن (قرارداد پاکستان) کو دیکھتا ہوں تو میری روح بے اختیار ماتم کرنے لگتی ہے۔
- مگر افسوس کہ لیگ کے محمد علی جناح سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی طرز فکر رکھتا ہو اور معاملات اسلامی نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہو۔ ☆☆☆

ملاّ اسٹیبلشمنٹ اتحاد؟

بغل میں چھری.....منہ میں رام رام

فاروق طارق (اگست 2003ء)

سنا ہے ہو بھی چکا ہے فراق ظلمت و نور
سنا ہے ہو بھی چکا ہے وصال منزل و گام
بدل چکا ہے بہت اہل درد کا دستور
نشاط وصل حلال و عذاب ہجر حرام

فیض احمد فیض

26 جولائی 2003ء کو اسلام آباد میں ہونے والی آل پارٹیز کانفرنس میں ہی یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ متحدہ مجلس عمل مشرف جمالی حکومت سے اتحاد کر رہی ہے اور یہ کہ اے آر ڈی اور متحدہ مجلس عمل کے پچھلے ایک سال سے چلنے والے ''متحدہ اپوزیشن'' میں دراڑیں پڑنے والی ہیں۔

کانفرنس کے دوران متحدہ مجلس عمل کے چیئرمین مولانا فضل الرحمان نے واضح انداز میں موجودہ حکومت سے مذاکرات کے ذریعے تعاون کی بات بار بار کی۔ تاریخی حوالے دیتے ہوئے انہوں نے مذاکرات کو ہی واحد حل بتایا جبکہ قاضی حسین احمد نے اجلاس کے دوران پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ کے بارے میں چبھتی باتیں کیں اور ان کو ڈی گریڈ کرنے کی کوشش کی۔

27 جولائی کو ہونے والے مذاکرات میں متحدہ مجلس عمل نے جنرل مشرف کو وردی میں اکتوبر 2004ء اور بعد ازاں 5 سال کے لیے صدر منتخب کرنے کی یقین دہانی کرائی۔ ان

مذاکرات میں اے آر ڈی کی پارٹیوں نے شرکت نہ کی تھی۔ مذاکرات کے بعد شیخ رشید، وفاقی وزیر اطلاعات، متحدہ مجلس عمل کی پیش کش پر اپنی پریس بریفنگ میں خوش نظر آ رہے تھے اور انہوں نے اس پیش کش کو ایک سنجیدہ پیش رفت قرار دیا۔ 28 جولائی کو ''نوائے وقت'' میں چھپنے والے ایک انٹرویو میں مولانا فضل الرحمان نے سیدھی سیدھی بات کی کہ ہم اپنی سرحد اور بلوچستان کی اسمبلیوں کو بچانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے پیپلز پارٹی پر حملہ کرتے ہوئے سوال کیا کہ اگر ان کی پنجاب اور سندھ میں حکومت ہوتی تو کیا وہ اس کی قربانی دیتے؟ 29 جولائی کو اے آر ڈی کے سربراہ نواب زادہ نصر اللہ خاں نے ایک پریس کانفرنس میں متحدہ مجلس عمل پر حملہ کرتے ہوئے کہا کہ ''گو مشرف گو'' کے نعرے لگانے والے اس کے ساتھ مل گئے ہیں اور یہ کہ 14 اگست کا جلسہ عام اب ان کے ساتھ مل کر کرنا مشکل ہوگا۔

پچھلے چند روز کے اس سیاسی پس منظر میں متحدہ مجلس عمل اور حکومت کے درمیان وقتی مفاہمت کے امکانات بڑھ گئے ہیں۔ متحدہ مجلس عمل کی قیادت نے اپنی ماضی کی پالیسیوں کے عین مطابق ''کبھی تھوڑی لڑائی کبھی تھوڑی صلح'' حکومت کے ساتھ اپنی تمام تر جمہوری بڑھک بازی کو یک طرفہ طور پر نفی کر دیا ہے اور اگلے چند روز میں حکومت متحدہ مجلس عمل کی اس پیش کش کو منظور کر کے اپنے اقتدار کی طوالت کو بڑھانے کے منصوبہ پر عمل کر سکتی ہے۔ متحدہ مجلس عمل کی موجودہ پالیسی میں کوئٹہ کے بدقسمت واقعات، امریکی سامراج کا بڑھتا ہوا دباؤ اور جنرل مشرف کے دورہ امریکہ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

متحدہ مجلس عمل کا حکومت سے کیا معاہدہ ہوتا ہے اس کی واضح تفصیلات تو ابھی آنی ہیں۔ کن نقاط پر کس نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ بھی طے ہونا باقی ہے۔ مگر ہم عمومی طور پر اس ممکنہ معاہدہ کی شقوں کا جائزہ لے کر مستقبل کے واقعات کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ متحدہ مجلس عمل کا مشرف جمالی حکومت سے موجودہ مصالحت کا مقصد اپنی دو حکومتوں کو بچانا ہے۔ مگر پس پردہ محرکات صرف دو حکومتوں کو بچانا نہیں انہیں۔ اصل ڈرامریکی سامراج کا مذہبی جنونی قوتوں کے

خلاف اقدامات سے ہے، صوبہ سرحد اور بلوچستان میں مذہبی قوتوں کی طاقت کے فروغ سے مذہبی جہادی قوتوں نے جو طاقت پکڑی اس کا اظہار ہیں۔ افغانستان میں امریکی و افغانی افواج کے خلاف بڑھتے ہوئے واقعات سے ہوتا ہے۔ 29 جولائی کو حامد کرزئی نے ''جیو'' کے نمائندہ حامد میر کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے پاس ثبوت ہیں کہ طالبان پاکستان سے افغانستان داخل ہو کر ہماری اور اتحادی افواج پر حملے کر رہے ہیں اور یہ کہ پاکستان ابھی تک طالبان کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔

ویسے تو یہ بات کب درست نہ تھی؟ طالبان کی پیدائش سے لے کر ان کے اقتدار کے خاتمے تک پاکستان کے حکمران طبقات کے کسی نہ کسی حصہ نے ان کی بھرپور مدد کی۔

امریکی سامراج کے نزدیک افغانستان کی سرحدوں پر دونوں صوبوں میں مولویوں کی حکومت ایک خطرناک حماقت تھی جس کا اظہار وہ بار بار کرتے رہے ہیں۔ جنرل مشرف کے دورہ امریکہ کے دوران اس بات کو بار بار دھرایا گیا کہ مذہبی جنونی قوتوں کی بنیاد ابھی تک پاکستان ہے۔ مشرف کے دورہ کے بعد پاکستانی حکمران طبقات نے مذہبی جنونی قوتوں کو کنٹرول کرنے کی کوششوں کا آغاز کیا۔ جس کو مذہبی قوتوں نے سمجھتے ہوئے پسپائی کا راستہ اختیار کیا اور ''کچھ لو اور کچھ دو'' کے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے جنرل مشرف کو مزید وقت دینے کا فیصلہ کیا۔ اس دوران مولانا فضل الرحمان نے بھارت کا وزٹ کیا اور اس دوران بھی انہیں بھارت دوستی کا بار بار پرچار کرنا پڑا۔

مذہبی جنونی قوتوں نے جنرل مشرف کو وردی سمیت صدر تسلیم کر کے اپنی حقیقی غیر جمہوری روایات کو برقرار رکھا ہے۔ یہ ان کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی، پاکستان میں جب بھی فوجی آمریت آئی، مذہبی قوتیں ان کے ساتھ کھڑی ہوئیں۔ ایوب، یحییٰ خاں اور ضیاء الحق کے ادوار میں یہ قوتیں ان کے ساتھ گاہے بگاہے کھڑی نظر آئیں۔

ملا اور اسٹیبلشمنٹ کے تعلقات میں بڑی دراڑ تو 11 ستمبر 2001ء کے واقعہ نے

ڈالی، جب مذہبی قوتیں اپنے سابقہ دوست امریکی سامراج کے گلے پڑ گئیں۔ اس کے بعد پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ نے بھی ظاہری طور پر مذہبی قوتوں سے اپنا ہاتھ کھینچنے میں عافیت سمجھی اور امریکی سامراج کے ساتھ مل کر افغانستان سے طالبان کی حکومت کو ختم کیا۔

چنانچہ 11 ستمبر کے بعد امریکی سامراج نے جو اقدامات افغانستان یا عراق میں کئے اور جس نفرت کو عالمی سطح پر اس نے جنم دیا، مسلمان ممالک میں اس کو زیادہ تر کیش مذہبی جنونی قوتوں نے کیا۔ یہ مذہبی جنونی قوتیں سامراج دشمن ووٹ کی چمپئن بن گئیں اور عوام کی ایک بڑی تعداد بھی ان کے ساتھ ہو گئی۔ ان کی طاقت میں واضح اضافہ ہوا اور ان کی گلیوں کی طاقت کے ساتھ ساتھ ان کی انتخابی حمایت بھی بڑھ گئی۔ اس انتخابی حمایت کا اظہار پاکستان سے سرحد اور بلوچستان میں ان کی اپنی یا مخلوط حکومتوں سے نظر آیا۔

جنرل مشرف کو وردی سمیت تسلیم کرنے کی پیش کش ابھی فائنل مراحل میں داخل نہ ہوئی ہے اس کی اونچ نیچ ابھی باقی ہے۔

یہ مذہبی جنونی قوتوں کی طرف سے ایک چال ہے جو وہ اپنے آپ کو بچاتے ہوئے اپنی طاقت میں مزید اضافہ کے پرسپکٹوز کے ساتھ چل رہے ہیں لیکن اب کیا ممکن ہے؟ جنرل مشرف کے ساتھ مذہبی قوتوں کا یہ ممکنہ اتحاد ایک عارضی نوعیت کا ہوگا۔ یہ کسی بھی صورت دونوں کے ماضی کے خوشگوار تعلقات کو دھرانے کا نام نہ ہوگا۔ کیونکہ عالمی اور قومی حالات بالکل تبدیل شدہ ہیں۔ مذہبی جنونی قوتیں اپنی موجودہ مصالحانہ کوششوں کے باوجود اسٹیبلشمنٹ کے دوست کے طور پر زیادہ دیر کام نہ کر سکیں گی۔ اسٹیبلشمنٹ سے عارضی کمزور اور وقتی نوعیت کا اتحاد ہوگا جو دونوں طرف سے منافقانہ بنیادوں پر کیا جا رہا ہے۔

مشرف کو معلوم ہے کہ مذہبی جنونی قوتوں سے اتحاد امریکی سامراج کو منظور نہ ہوگا۔ اور نہ ہی مذہبی قوتیں مشرف حکومت کے اشاروں پر کام کر کے اپنی موجودہ حیثیت کو مزید اضافہ دے سکیں گی۔ موجودہ مصالحانہ کوششوں کے باوجود مشرف حکومت ایک یا دوسرے بہانے سرحد اور

بلوچستان کی حکومتوں اور مذہبی قوتوں کے خلاف اقدامات کرنے پر مجبور ہوگی۔ مذہبی قوتیں بھی مشرف حکومت کی غیر مقبولیت کو اور بڑھتے دیکھ کر اس کے خلاف زیادہ اپوزیشن کرنے کی پوزیشن میں جائیں گی۔

متحدہ مجلس عمل کو مشرف سے موجودہ ممکنہ اتحاد بہت مہنگا پڑ سکتا ہے۔ ان کا اتحاد بھی ٹوٹ سکتا ہے۔ ان کی حکومتیں بھی ختم ہو سکتی ہیں اور ان کی بڑھتی ہوئی طاقت بھی کم ہو سکتی ہے۔

مذہبی قوتوں کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کی بنیاد ان کی سامراج دشمنی کا تاثر ہے۔ وہ سامراج کے سب سے بڑے دوست مشرف کے ساتھ اتحاد میں جا کر اپنی وہ بنیاد ہی کھو دیں گے، جس پر ان کی عمارت قائم ہو رہی ہے۔ اس کا ادراک خود مذہبی قوتیں بھی کریں گی، اس لیے ہم اس ممکنہ اتحاد کو عارضی نوعیت کا قرار دے رہے ہیں جس کے بعد خون خرابے کا ایک اور دور شروع ہو سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مذہبی جنونی قوتوں کے موجودہ انتہائی منافقانہ عمل کو بے نقاب کیا جائے۔ بائیں بازو کی قوتوں کو اکٹھا کیا جائے اور ان کے اتحاد کے ذریعے مذہبی قوتوں کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کو روکتے ہوئے ایک حقیقی طبقاتی اتحاد کو جنم دیا جائے۔

☆☆☆

فرقہ واریت کی مختصر تاریخ

خشونت سنگھ

یہ دو ہزار سال سے زیادہ عرصہ پہلے کی بات ہے بدھ مت ہندوستان میں عروج پر تھا۔ شہنشاہ اشوک بدھ مت قبول کرنے والا سب سے زیادہ مشہور انسان تھا جب برہمنی ہندو مت نے شاہی خاندانوں میں دوبارہ قبولیت حاصل کی۔ خصوصاً نویں اور دسویں صدی میں تو بدھوں کا قتل عام ہوا اور ان کی عبادت گاہوں کو مسمار کر دیا گیا بعد ازاں بہت سے مسلمان حکمرانوں کے دور میں ہندوؤں سے امتیاز برتا گیا۔

برطانیہ ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔ تاہم ہندوستان میں لوگوں کو تقسیم کرنا اور لڑانا کبھی مشکل نہیں رہا تھا۔ وقتاً فوقتاً ہندو مسلم فسادات ہوتے رہتے تھے اور برطانیہ کے لیے یہ صورت حال اس وقت گوارا تھی کہ جب تک ان کی سلطنت کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔ عیسائی فطری طور پر برطانوی اقتدار کے دوران اپنے آپ کو زیادہ محفوظ محسوس کرتے تھے۔ تاہم اس دور میں مذہب کے نام پر حکومت نے کوئی دارو گیر نہیں کی۔ امتیاز کی بنیاد نسلی تھی۔

آزادی کے ساتھ عمل میں آئی اور ہندوستان کی تاریخ کا بدترین فرقہ وارنہ تشدد ہوا۔ میں اس پاگل پن کا عینی شاہد ہوں اور میرا خیال تھا کہ قوم اپنے انجام کے قریب پہنچ گئی ہے۔ میں اگست 1947ء کے پہلے ہفتے میں لاہور میں تھا میں اسی مہینے کے دوسرے نصف حصے میں دہلی تھا۔ مجھے نہیں پتا کہ میں کس ملک سے تعلق رکھتا ہوں۔۔۔۔ ہندوستان سے یا پاکستان سے! میں ایک ایسی بستی میں پیدا

ہوا تھا جو آج کے پاکستان کے قلب میں واقع تھی۔ میں اپنی باقی زندگی لاہور میں گزارنا چاہتا تھا مجھے ان مسلمانوں سے ہمدردی تھی جو اپنے لیے ایک الگ ریاست کے خواہش پسند تھے اور میں اسی مسلم ریاست میں زندگی بسر کرنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کر چکا تھا۔ مجھے ایسا کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ میرے لاہور چھوڑنے سے ایک ہفتے پہلے میرے دائیں بائیں والے ہمسایوں نے اپنی مذہبی شناخت اپنے گھروں کے باہر بڑے بڑے الفاظ اور علامت میں عیاں کر دی۔ میری بائیں طرف والی دیوار پر اردو میں لکھا تھا: پارسی کا مکان۔ دوسری دیوار پر بہت بڑی صلیب بنائی گئی تھی جو اس امر کا اظہار تھا کہ اس گھر کے مکین عیسائی ہیں۔ انہیں یہ تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ نزدیکی علاقے مزنگ کے لوگوں نے ہندوؤں اور سکھوں کے گھروں کو لوٹنے اور ان پر زبردستی قبضہ کرنے کے لیے نشان زد کرنا شروع کر دیا تھا مجھ پر روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ پاکستان میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ کوئی اور نہیں صرف یہ تھی کہ میں سکھ تھا۔

نئی سرحد کے مشرق میں کلکتہ میں ہونے والے طویل ہندو مسلم فسادات بہار میں مسلمانوں کے قتل عام کا پیش خیمہ بنے۔ جس کے جواب میں مشرقی بنگال میں نواکھائی میں ہندوؤں کو مارا گیا۔ ہندوؤں اور سکھوں کے قافلے تحفظ کے لیے سرحد پار جانے لگے بیشتر راستے ہی میں مارے گئے۔

کچھ وقت کے لیے اپنے گھر سے محروم ہونے اور ہزاروں لوگوں کی ہلاکت اور لاکھوں کی بے گھری کا صدمہ نئی نئی حاصل ہونے والی آزادی کی خوشی نے دھیما کر دیا۔ میں 14\15 اگست 1947ء کو آدھی رات کے وقت پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے جمع ہو جانے والے بہت بڑے ہجوم میں شامل تھا۔ کامل سکوت میں ہم نے سچیتا کرپلانی کو وندے ماترم گاتے اور پنڈت نہرو کی تقریر سنی۔ ہم وہاں صبح طلوع ہونے تک موجود رہے ''بھارت ماتا کی جے'' اور'' مہاتما گاندھی کی جے'' جیسے نعرے لگا لگا کر ہمارے گلے بیٹھ گے۔

جب وہ وقت گزر گیا تو دھیرے دھیرے مجھ پر سچ عیاں ہونے لگا۔ کیا یہی وہ آزادی

ہے، جس کا ہمیں اتنا انتظار تھا؟ فیض احمد فیض کی اگست 1947ء میں لکھی ہوئی نظم مجھے یاد آ رہی ہے:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
کہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل

میں لاکھوں دوسرے پناہ گزینوں کی نسبت زیادہ خوش قسمت تھا کہ لاہور والا گھر کھو دینے کے بعد یہاں میں اپنے باپ کے گھر آ گیا تھا۔ جلد ہی مجھے وزارت خارجہ میں نوکری مل گئی۔ تاہم تقسیم کے فسادات کی یادیں مجھے دہشت زدہ کرتی رہیں۔ مجھے امرتا پریتم کا وہ لافانی نوحہ یاد آتا تھا، جس میں اس نے ''ہیر رانجھا'' کے شاعر وارث شاہ کی روح سے مخاطب ہو کر کہا تھا:

اج آکھاں وارث شاہ نوں اٹھ قبراں وچوں بول
اتے نویں کتاب عشق دا کوئی اگلا ورقا پھول
اک روئی دھی پنجاب دی توں لکھ لکھ مارے وین
اج لکھاں دھیاں روندیاں تینوں وارث شاہ نوں کہن
او دردمنداں دیا دردیا اٹھ تک اپنا پنجاب
بیلے لاشاں وچھیاں لہو دبھری چناب

آزاد ہندوستان میں حالات معمول پر آنے لگے میرا خیال تھا کہ ہم بدترین حالات دیکھ چکے ہیں اور مجھے امید تھی کہ ہندو مسلم فساد دوبارہ کبھی نہیں ہوں گے۔ برطانیہ نے اپنے اقتدار کے دوام کے لیے برادریوں کو جدا جدا رکھا تھا۔ اب جب کہ وہ چلے گئے ہیں تو ہم مذہبی لسانی اور ذات پات کی تفریقوں پر حاوی آ کر ایک مشترک ہندوستانی تشخص وضع کریں گے۔ مجھے امید تھی کہ تقسیم کے وقت بہنے والے بے پناہ خون کے ساتھ ہمارے جسموں میں موجود فرقہ واریت

کا زہر بھی نکل گیا ہوگا۔

افسوس چند سال کی خاموشی کے بعد فرقہ واریت کا وائرس ملک کے مختلف حصوں میں دوبارہ نمودار ہوگیا۔ کمیشن آف انکوائری نے صریح الفاظ میں کہا کہ آزادی کے بعد ہونے والے تمام ہندو مسلم فسادات میں ہونے والا ستر فیصد جانی و مالی نقصان مسلمانوں کا ہوا۔ فرقہ وارانہ تشدد پر قابو پانے میں پولیس کی غیر جانبداری پر مجھے تو یقین ہے تاہم مجھے اکثریتی برادری کی طرف سے بہتر کارکردگی کی امید تھی پولیس اپنے فرائض ادا کرنے میں ناکام رہی اور سیاستدانوں نے اس کا فائدہ اٹھایا۔

اندرا گاندھی کے وزیر اعظم بننے کے بعد مذہب کا سیاست میں عمل دخل زیادہ ہونے لگا۔ مذہب اور برادری کی بنیاد پر قائم سیاسی پارٹیوں نے سیاسی فائدے کے لیے لوگوں کے مذہبی اور فرقہ وارنہ جذبات سے کھیلنے لگیں۔ انہیں اپنے وحشیانہ ترین خوابوں سے بھی زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔ ہم ایک ایسے موڑ پر آچکے ہیں جہاں ہندوستانی سیکولرازم کو "نام نہاد" کہنا مبالغہ آرائی نہیں ہوگی۔ برطانوی حکمرانی کے دوران فرقہ وارانہ تشدد صرف ہولی عید الاضحیٰ اور گن پتی تہوار جیسے مواقع پر ہندو مسلم تصادمات تک ہی محدود تھا۔ فسادات صرف چند فساد زدہ شہروں ہی میں ہوتے تھے۔ آج فسادات ہندوؤں اور مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں، ہندوؤں اور عیسائیوں، بڑی ذات کے ہندوؤں اور ہریجنوں، قبائلیوں اور غیر قبائلیوں، بنگالیوں اور آسامیوں، مہاراشٹریوں اور کناڈیگوں میں ہوتے ہیں۔ پورا ملک فساد زدہ بن گیا ہے ہر شخص کا ہاتھ اپنے ہمسائے کے گریبان پر ہے کیونکہ وہ اپنے ہمسائے کی ہر شے حاصل کر لینا چاہتا ہے۔۔۔۔ اس کی زمین، اس کی ملازمت یا اس کا کاروبار نسلی، مذہبی اور لسانی اختلافات ایسا کرنے کے لیے بہانہ بن جاتے ہیں۔ تعلیم یافتہ درمیانے طبقے کے تاجر (درمیانہ طبقہ ہی بی جے پی کا حلقہء انتخاب ہے) اور سیاستدان (شاید کمیونسٹوں کے استثنا کے ساتھ) فسادیوں کو تحریک دیتے ہیں۔ ان کا آلہء کار بنتے ہیں بے عقل لوگ اور تعلیم یافتہ بے روزگار اور جیسا کہ 2002ء میں گجرات نے ہمیں دکھا دیا، وہ محروم لوگ جنہیں جذباتی تقریروں، دلکش کذب وافترا اور نقد رقوم کی خطرناک کاک ٹیل کے ذریعے قتل وغارت گری پر آمادہ کیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

بھارتیا جنتا پارٹی ووٹ لینے کے لیے

بنیاد پرستی پھیلاتی ہے

کیمونسٹ پارٹی آف انڈیا (مارکسسٹ لیننسٹ) (CPIML) کی سنٹرل کمیٹی کی رکن کامریڈ سری لتا سوامی ناتھن کی پاکستان آمد

انٹرویو: جدوجہد پینل

س. ہندوستان میں محنت کش عوام اور CPI(ML) کی جدوجہد کے بارے میں بتائیں؟

ج۔ ہندوستان کی 80\70 فیصد آبادی زراعت کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ وہ بہت اہم ہے اور بہت سارے مسائل میں گھری ہوئی ہے۔ لہذا ہماری توجہ کا محور کھیت مزدور اور کسان ہیں ہماری پارٹی کا زیادہ تر کام کھیت مزدوروں میں ہے۔ 15 لاکھ کھیت مزدور ہماری پارٹی کے ساتھ ساتھ وابستہ ہیں۔ تقریباً انیس صوبوں میں ہماری پارٹی کے کسان ونگ ہیں۔ دولت کی تقسیم زمین کی تقسیم ہمارا ایجنڈہ ہے۔ ساتھ ساتھ حقیقی جمہوریت کے لیے بھی ہماری جدوجہد جاری ہے۔ ہندوستان میں ذات پات بہت بڑا مسئلہ ہے۔ دلت قبیلہ جیسی ذاتیں اور خواتین گھمبیر مسائل کا شکار ہیں۔ ان کے حقوق اور مسائل کے حل کے لیے ہماری جدوجہد جاری ہے۔ 56 سال سے ہم آزاد ہیں۔ لیکن بھوک سے آزاد نہیں ہوئے بے انصافی سے آزاد نہیں ہوئے آزادی تو ہمیں ملی ہی نہیں۔ گلوبلائزیشن کی شکل میں ایک اور آفت آگئی ہے۔ معاشی طور

پر سامراج کے غلام بنتے جارہے ہیں۔ سامراج سرمایہ دار اور مذہبی فاشٹ ہمارا مل کر استحصال کررہے ہیں یہ تینوں اتحادی ہیں ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔

س ۔ بی جے پی کا گلوبلائزیشن کے بارے میں کیا نقطہ نظر ہے؟

ج۔ بھارت کے حکمران طبقہ نے ہمیشہ دیش کو بیچا ہے سکندر اعظم سے لے کر تمام غیر ملکی آقاؤں کے سامنے حکمران طبقہ نے گھٹنے ٹیکے۔

حکمرانوں نے ذات پات اور مذہب کی بنیاد پر قوم کو تقسیم کیا ہوا ہے۔ 80 فیصد جنتا کو پانچ ہزار سال سے غلام بنایا ہوا ہے بی جے پی والے مسلمانوں کو گالیاں دیتے ہیں لیکن ہندو راجہ نے ابراہم لودھی کو ہندوستان بلایا۔ حکمران عوام کی محنت کا پیسہ لوٹ کر باہر بھیج رہے ہیں۔ حکمرانوں کے بچے اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جارہے ہیں۔ غریبوں کے بچوں سے تعلیم چھینی جارہی ہے۔

س۔ ہندوستان میں بنیاد پرستی کی کیا وجوہات ہیں اس کی بنیاد یں مذہبی ہیں یا قومی ہیں؟

ج۔ فاشزم ہمیشہ نیشلزم کو استعمال کرتا ہے۔ چاہے ہٹلر ہو، چاہے مسولینی ہو! یہ سوڈو نیشنلزم ہے بلکہ جنگو ازم ہے۔ جنتا کو بڑھکاؤ، نان ایشیوز ابھار کر عوام کی اصل مسائل سے توجہ ہٹاؤ، لوگ بھوکے مررہے ہوں تو نام نہاد نیشلزم کے نعروں کا کیا فائدہ۔ معاشرے میں جتنی زیادہ مہنگائی بھوک کرپشن جہالت بڑھے گی۔ اتنا ہی زیادہ شاونزم اور بنیاد پرستی پھیلے گی۔ بھارت اور پاکستان میں لڑائی اپنی کرسی کو بچانے کے لیے کرواتے ہیں۔

س۔ مسئلہ کشمیر پر آپکا کیا موقف ہے؟

ج۔ میرا نقطہ نظر ہے کہ محکوم قوموں کو حق خودمختاری دو، کشمیریوں کو اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرنے دو، لیکن گلوبلائزیشن کے عہد اور یونی پولر ورلڈ میں آزادی کو کس طرح مستحکم کیا جاسکتا ہے؟ افغانستان اور عراق کی جنگوں کے بعد امریکی سامراج کا ان پر قبضہ ہوگیا ہے سامراجی سرمایہ دار

ی میں کشمیر کی آزادی کا مطلب ہے USA کو دینا۔اب امریکہ سنٹرل ایشیاء کے تیل اور گیس پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔

س. کیا بھارت میں WTO کی تعلیمی پالیسیاں لاگوں کی جارھی ھیں؟

ج۔ امریکہ IMF, WTO بھارت پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ تعلیم کی نجکاری کرو بلکہ سارا سوشل سیکٹر پرائیویٹائز کردو۔

س. گلوبلائزیشن میں قومی سرمایہ داروں کے ساتھ آپ کی پارٹی کا کیا رویہ ھو گا؟

ج۔قومی سرمایہ دار بھارت میں کوئی مضبوط نہیں ہے۔ان کا گلوبلائزیشن کے خلاف لڑنا مشکل ہے اس لڑائی کو کون آرگنائز کرے؟ کون لیڈ کرے؟ فیڈریشن آف چیمبر کا رول بھی کم ہوتا جارہا ہے۔گلوبلائزیشن میں دیکھنا پڑھے گا کہ بورژوازی ہے کہ نہیں ۔لیکن جہاں بھی ہم طاقت کو توڑ سکتے ہیں توڑنا چاہیے۔کنکون (میکسکو) شہر میں کچھ عرصہ بعد زراعت پر معاہدہ ہورہا ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ ہم اپنے ڈیتھ وارنٹ پر سائن کررہے ہیں۔WTO پر سائن کردیئے ہیں۔یہ سارا سامراج ہے۔

س. افغانستان پر انڈین لیفٹ کی کیا پوزیشن تھی؟

ج۔افغانستان میں طالبان فیکٹر افغانوں کا اندورنی معاملہ ہے وہاں پر عوامی قوتوں کی ذمہ داری ہے کہ ان کہ ہٹائیں غیر ملکی مداخلت درست نہیں ہے۔افغانستان میں جو لوگ بائیں بازو کی جدوجہد کررہے ہیں ان کو مضبوط کرنا چاہیے۔کیا افغانستان کے اندر ایسا مضبوط لیفٹ ہے؟

س. واجپائی سرکار کی حکومتی پالیسیوں کے متعلق بتائیں؟

ج۔بی جے پی حکومت کی کوئی معاشی پالیسی نہیں ہے بی جے پی صرف مڈل کلاس کی نمائندگی کرتی ہے۔کانگرس سرمایہ داروں کی نمائندہ ہے۔لیفٹ کمیونزم کی بات کرتا ہے لیکن بی جے پی سرمایہ داری کے ایجنڈا پر جائے گی۔بی جے پی ہندو شاونزم کو استعمال کرتی ہے۔ووٹ لینے

کے لیے بنیاد پرستی کو پھیلاتی ہے۔شور مچاتی ہے کہ مسلمانوں کی آبادی بڑھ رہی ہے اور وہ ہماری نوکریوں کو لے رہے ہیں۔ مذہب کی بنیاد پر عوام میں نفرت اور پھوٹ ڈالی جاتی ہے۔لیکن ہمیں مذہبی بنیاد پرستی کے خلاف طبقاتی بنیادوں پر منظم ہو کر جدوجہد کرنی ہے۔واجپائی سرکار کا اینٹی مسلم اور اینٹی کمیونسٹ ایجنڈا ہے۔ہمیں خوشی ہے کہ واجپائی سرکار نے عراق میں فوج بھیجنے سے انکار کر دیا ہے۔لیکن انڈین حکومت امریکہ اور اسرائیل کے ساتھ دوستی کا ہاتھ بڑھا رہی ہے۔9 ستمبر کو اسرائیلی وزیر اعظم آ رہا ہے یہ بڑی افسوس ناک بات ہے۔

س. کیا آپ ھندوستان کے عوام کے مسائل کا حل سوشلزم میں سمجھتی ھیں؟

ج۔جی ہاں ہمارے عوام کے مسائل صرف سوشلزم میں ہی حل ہو سکتے ہیں۔

☆☆☆

ملاء ملٹری الائنس سے جمہوریت کم اور آمریت زیادہ ہوگئی

سامراجی معاشی پالیسوں پر دونوں کے اتفاق سے بے روزگاری اور غربت بڑھتی رہے گی

فاروق طارق (جنوری 2004ء)

24 دسمبر کو ایم ایم اے سے مسلم لیگ قائداعظم گروپ کا معاہدہ، 25 دسمبر کو جنرل مشرف پر 11 روز میں دوسری دفعہ قاتلانہ حملہ، بعدازاں قومی وصوبائی اسمبلیوں سے 17 ویں ترمیم کی دوتہائی اکثریت سے منظوری اور یکم جنوری 2004 کو جنرل مشرف کا سادا اکثریت سے اعتماد کا ووٹ پچھلے دو ہفتوں کے اہم واقعات ہیں۔ جنرل مشرف سارک کانفرنس میں مولویوں کی بھرپور مدد سے اب ''قانونی'' صدر بن کر شامل ہوئے ہیں اور انہوں نے انگلی کٹا کر جمہوری شہیدوں میں اپنا نام لکھوالیا ہے۔

متحدہ مجلس عمل جس میں مذہبی جنونی عناصر سے لے کر عام مذہبی افراد تک شامل ہیں کی قیادت نے اپنی ماضی کی روایات کے عین مطابق ایک بار پھر ایک فوجی حکومت کو ''مستحکم'' ہونے کا قانونی جواز فراہم کر دیا ہے۔

Abstain رہنا، حمایت کے مترادف

اگر چہ ایم ایم اے قیادت نے جنرل مشرف کو اعتماد کا ووٹ دینے کی بجائے پارلیمنٹ میں موجود رہنے اور abstain رہنے کا فیصلہ کیا مگر اس قدم کو پہلے طے کر لیا گیا اور جنرل مشرف کو وردی سمیت صدر ہونے کا راستہ ایم ایم اے کی مرضی کے مطابق صاف کر دیا گیا۔ abstian یعنی ووٹ نہ ڈالنا در حقیقت جنرل مشرف کی حمایت کے مترادف ہی تھا اور یہ قدم بھی مولویوں کی ماضی کی روایات کے عین مطابق تھا۔ ''تھوڑی سی مخالفت اور بہت ساری حمایت''۔

اس قدم کو ایم ایم اے کے ہی ایک رکن پنجاب اسمبلی نے منافقت پر مبنی قرار دیتے ہوئے مشرف کو اعتماد کا ووٹ دینے کی وکالت کی اور خود ووٹ بھی دیا۔

متحدہ مجلس عمل کی جانب سے حکومت کے ساتھ معاہدہ واضح طور پر جنرل مشرف کی ''جیت'' کے مترادف ہے۔ اس میں وقتی نقصان ایم ایم اے کا ہوگا اگر اگر ایم ایم اے کا راستہ ایک بڑے عوامی پروگریسو متحدہ محاذ بنا کر نہ روکا گیا تو یہ وقتی شکست ہی ثابت ہوگی۔

اے آر ڈی کی غلط حکمت عملی

اے آر ڈی کی جماعتوں نے بھی مشرف کی کھل کر مخالفت کرنے کی بجائے اسمبلیوں کے بائیکاٹ کی فیصلہ کر کے جنرل مشرف کو مضبوط کیا۔ اے آر ڈی کے ممبران اگر کھل کر اسمبلی میں 17 ویں ترمیم کے خلاف ووٹ دیتے اور بعد ازاں اس کو اظہار اعتماد کے ووٹ کا بائیکاٹ کرنے کی بجائے اس کی مخالفت میں ووٹ دیتے تو عوام کو نظر آتا کہ اسمبلیوں میں ابھی اس کی بھرپور مخالفت موجود ہے۔ مگر بائیکاٹ کا فیصلہ کر کے اے آر ڈی نے اپنے ممبران کو ٹیسٹ میں نہ ڈالا۔ اگر ووٹ مخالفت میں ڈالنے کا فیصلہ ہوتا تو اے آر ڈی کے کئی سرمایہ دار جاگیر دار سیاست دان شائد مشرف کی مخالفت میں ووٹ ڈالنے کی جرأت نہ کرتے اور چپکے چپکے کھسکنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے۔ اے آر ڈی جنرل مشرف کے پورے چار سالوں میں اپنی نعرے بازی کے باوجود ابھی تک اس کے خلاف کوئی واضح جامع حکمت عملی اختیار نہ کر سکی ہے۔ ایم ایم اے کو سمجھے بغیر اس کے ساتھ بار بار الائنس کرنے کی سیاست نے اے آر ڈی کے سٹیٹس کو نقصان پہنچایا ہے۔ لاہور

میں ایم ایم اے کے تین ممبران پارلیمنٹ مسلم لیگ (ن) کی جانب سے ان کی مکمل حمایت کرنے کے فیصلہ کے نتیجہ میں جیت گئے اور ایم ایم اے نے بالآخر اس فوجی آمر کو وردی سمیت صدر تسلیم کرلیا جس نے مسلم لیگ ن کی حکومت کو گرایا۔

مشرف ایم ایم اے معاہدہ

متحدہ مجلس عمل نے حکومت کے ساتھ معاہدہ سے ایل ایف او کو بہت چھوٹی ترامیم کے ساتھ آئین کا حصہ بنادیا۔ ایک حاضر سروس جرنیل تمام جمہوری روایات کا تقدس پامال کرتے ہوئے مولویوں کی مدد سے صدر ''منتخب'' ہوگیا۔ آئین میں غیر جمہوری، آمرانہ روشیں رکھنے والی، فوج کو جمہوری سیٹ اپ میں حصہ دلوانے والی ترامیم کو حصہ بنانے کی تمام تر ذمہ داری مولویوں کے متحدہ مجلس عمل پر عائد ہوتی ہے۔ یہ معاہدہ ایک آمر کو قانونی بنانے کا عمل کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ معاہدہ جمہوری پراسس میں رکاوٹیں ڈالنے والوں کو کسی سزا کے بغیر (neat and clean) صاف ستھرا راستہ فراہم کرتا ہے جس پر چل کر وہ آمرانہ دور سے ایک ''جمہوری دور'' کا لیبل لگا سکتے ہیں۔ مولویوں اور فوجی آمریت تلے پنپنے والے سیاست دانوں کے درمیان یہ معاہدہ چالاک سرمایہ دار جاگیردار سیاست دانوں کی منافقانہ، موقع پرستانہ اور آمرانہ روشیں پالنے والوں کو یہ سبق دیتا ہے کہ وہ مستقبل کے کسی بھی جمہوری دور کو ایک دفعہ پھر ختم کرنے والی فوجی آمریت کے ساتھ پینگیں بڑھا سکتے ہیں اور ایسے کرنے سے ان کے لیے کوئی مشکلات نہیں ہیں انہیں باہر نکلنے کا محفوظ راستہ دینے والی قوتیں ایک یا دوسری شکل میں سامنے آتی رہیں گی۔

مشرف ایم ایم اے معاہدہ میں جیت آمریت کی ہوئی۔ جمہوریت کی ہار ہوئی۔ اس معاہدہ سے جمہوریت اور کم ہوگئی۔ آمریت اور بڑھ گئی۔ یہ دو غیر جمہوری قوتوں کے درمیان معاہدہ تھا، جو آمرانہ روشوں کو کبھی فوجی آمریت کے نام پر اور کبھی مذہبی جواز فراہم کر کے پرورش کرتے رہتے ہیں۔

معاہدہ کی رو سے نیشنل سیکورٹی کونسل کو اب پارلیمنٹ ذریعے بنایا جائے گا۔ فوجی

جرنیل اس کونسل کو باضابطہ طور پر جمہوری طرز پر چلانے میں اپنا کردار ادا کریں گے۔ یہ شق بنیادی طور پر ترکی میں موجود فوج کے آئینی اختیارات کو پاکستان میں لانے کا موجب بنے گی۔

معاہدہ کی رو سے جنرل مشرف ایک صدر کے طور پر ماضی کے وہ انتہائی آمرانہ اختیارات سنبھال لے گا جو دس سالوں میں ''منتخب'' ہونے والی ہر جمہوری حکومت کو قبل از وقت اتارنے کے لیے استعمال ہوتے رہے ہیں۔ 29 مئی 1988ء کو جنرل ضیا نے 58\-2B کا استعمال کرتے ہوئے جونیجو حکومت کو' 6 اگست 1990ء کو، غلام اسحاق نے بے نظیر حکومت کو' اپریل 93 میں، غلام اسحاق خان نے نواز شریف حکومت کو اور ستمبر 1996ء میں فاروق لغاری نے بے نظیر حکومت کو برطرف کر دیا تھا۔ اب جنرل مشرف ایک آمر کہلائے بغیر قانونی طور پر جمالی حکومت یا اس کے گورنرز کسی بھی صوبائی حکومت کو کسی بھی وجہ کے بغیر برطرف کر سکتے ہیں۔ یہ آمرانہ اختیارات کے ایک شخص کے ہاتھ اکٹھے ہونے کی بدترین شکل ہے۔ اسے حقیقت بنانے میں مولویوں نے مشرف کا بھرپور ساتھ دیا۔ اس میں جو معمولی ترمیم ایم ایم اے نے کروائی وہ یہ کہ برطرفی کے ایک ماہ کے اندر اندر سپریم کورٹ سے رجوع کرنا پڑے گا۔ اسے پنجابی میں کہتے ہیں ''گھونگھلوں (شلجم) سے مٹی جھاڑنا''

اب کیا ہو سکتا ہے؟

سیاست ہمیشہ معیشت کا عکس ہوتی ہے ایم ایم اے اور جنرل پرویز مشرف کی معیشت کی حکمت عملی تقریباً ایک جیسی ہے۔ دونوں پرائیویٹ پراپرٹی پر یقین رکھتے ہیں یعنی سرمایہ دارانہ نظام کو قائم دائم رکھنا چاہتے ہیں۔ دونوں کو نج کاری پر کوئی اعتراض نہیں۔ دونوں کو عالمی اداروں کی طے کردہ شرائط پر کوئی اعتراض نہیں۔ ایم ایم اے حکومت سرحد میں ''انتہائی ذمہ داری'' سے سامراجی معاشی پالیسوں پر عمل درآمد کرانے میں مدد دے رہی ہے۔

دونوں کی متفقہ پالیسوں کے نتیجہ میں پاکستان سارک ممالک میں واحد ملک بن گیا ہے جہاں غربت کم ہونے کی بجائے بڑھ رہی ہے۔ جنرل مشرف جس تیزی سے نج کاری کے راستہ

پر گامزن ہے، ڈی ریگولیشن کر رہا ہے، ٹیرف کم کر رہا ہے، اتنی تیزی سے ہی پاکستان میں بے روزگاری اور بڑھے گی اور غربت مزید پھیلے گی۔ اس کی حکومت کا غربت مکاؤ پروگرام صرف چیرٹی کی حد تک ہے جو کہ غربت میں کمی کی بجائے ہاتھ پھیلانے والوں میں اضافے کا باعث بن سکتا ہے۔

امریکی سامراج کی طرف سے مشرف کی بھرپور حمایت کے باوجود سوشل سیکٹر میں کسی ڈرامائی تبدیلی کی بجائے ملک میں موجود امارت اور غربت میں فاصلے بڑھ گئے ہیں۔ آنے والے دور میں بھی ایسا ہی ہوگا۔ اور ایسا ہونے سے جنرل پرویز کی حکومت کبھی بھی عوامی سطح پر مستحکم نہیں ہوسکتی اس کی حکومت کی جانب ''ترقیاتی کاموں'' کی بنیاد پر یہ سوچنا کہ ان کی مقبولیت بڑھ رہی ہے، عوامی شعور کو نہ پہچاننے کی علامت ہے۔

جنرل پرویز مشرف اگرچہ سیاسی طور پر سامراجی قوتوں کے لیے اب زیادہ قابل قبول ہوگا اور ایم ایم اے مشرف معاہدہ نے ایل ایف او کو آئین کا حصہ بنا کر شائد دولت مشترکہ کے وہ اعتراض اب دور کر دیئے ہیں جن کی بنیاد پر پاکستان کی ممبرشپ مسلسل معطل رکھی جا رہی تھی۔ اس طرح بش اور بلیئر بھی ایک آئینی صدر پرویز مشرف سے زیادہ کھل کر دوستی کر سکتے ہیں بنسبت ایک فوجی آمر کے۔ سوال یہ ہے کہ مشرف کی پہلے کی نسبت زیادہ سامراجی دوستی، عوام کے لیے ایک اچھی خبر ہے یا بری خبروں کا ایک تسلسل ہے؟ ہمارے خیال میں سامراج مشرف دوستی، سامراجی معاشی معاہدوں کی زیادہ حفاظت کرے گی اور ان پر کھل کر عمل درآمد کرانے میں مددگار ہوگی۔ نتیجتاً غربت اور بے روزگار میں اضافہ امارت اور غربت کے درمیان زیادہ فاصلہ۔

اس صورتحال میں مشرف کا 2 جنوری 2004ء کو ٹی وی پر یہ اعلان کہ ''پارلیمنٹ 5 سال کی مدت پوری کرے گی'' ایک نعرے کے علاوہ حقیقت کے کوئی زیادہ قریب نہیں۔ بڑھتا ہوا معاشی بحران جو 2005ء میں ڈبلیو ٹی او کے معاہدہ پر عمل درآمد کے بعد اور زیادہ تیز ہوگا نئے سیاسی تضادات کو سامنے لاسکتا ہے اور جس کا مطلب موجودہ پارلیمنٹ یا مشرف کوئی ایک یا دونوں

بھی وقت پورا کرنے سے قبل جاسکتے ہیں۔

متحدہ مجلس عمل کا مستقبل

یہ معاہدہ متحدہ مجلس عمل کی سامراج کے خلاف مسلسل نعرہ بازی میں ایک وقفہ ہے یہ ان کی اینٹی سامراج ہونے کے دعویٰ کی کسی حد تک نفی کرتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ سامراج کے قریب ترین دوست مشرف کو قانونی بننے کے لیے ایک ''سامراج دشمن'' ایم ایم اے دن رات ایک کر رہی ہو؟ ان کی سامراج دشمنی کا دعویٰ غلط ہے یا مشرف دوستی کا۔

متحدہ مجلس عمل اس معاہدہ کے بعد ٹوٹ پھوٹ کا شکار بھی ہوسکتی ہے اور اس کے کچھ آثار نظر آرہے ہیں۔ سینٹ میں مشرف کی مخالفت میں واحد ووٹ بھی متحدہ مجلس عمل کے ہی پروفیسر ساجد میر کا تھا۔ اب اگر ایم ایم اپنے اصولوں پر چلتی ہے تو اسے اس پارٹی ''اہل حدیث'' کو تو نکال باہر پھینکنا چاہیے۔

یہ معاہدہ متحدہ مجلس عمل کی بڑھتی ہوئی مقبولیت میں بھی ایک وقفہ ہے۔ یہ معاہدہ عوامی حمایت حاصل کرنے کے لیے نہیں، بلکہ ایم ایم اے نے فوج سے اپنے بگڑے تعلقات ٹھیک کرنے کے لیے کیا ہے۔ یہ معاہدہ متحدہ مجلس عمل کی طرف سے ایک شعوری کوشش ہے کہ 11 ستمبر پہلے والے حالات واپس آجائیں۔ مگر وہ بدلتی عالمی صورتحال میں سامراجی ہتھکنڈوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اس معاہدہ کے باوجود مشرف اور متحدہ مجلس عمل میں زیادہ دیر قربت کا سفر جاری نہیں رہ سکتا، نہ ہی ریاست کے مذہبی جنونیوں سے ماضی کے تعلقات بحال ہوسکتے ہیں۔ اس معاہدہ کے باوجود اس امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا کہ سرحد میں ایم ایم اے کی حکومت کو ختم کردیا جائے افغانستان میں کوئی بڑا واقعہ یا پاکستان میں مشرف، جمالی یا کسی دیگر اہم شخصیت پر مزید حملے صورتحال کو اس جانب لے جاسکتے ہیں۔

لیکن کیا ایم ایم اے بھی ریاستی پشت پناہی بننے والی دیگر سیاسی طاقتوں کی طرح ایک خاص حد تک مقبول ہونے کے بعد بریک لگائے گی یا وہ ''اسلامی انقلاب'' لانے کے لیے اپنے

طور پر اقتدار سنبھال سکتی ہے؟ ایم ایم اے کے اقتدار سنبھالنے کی صورتحال تو مشکل ہی نظر آتی ہے مگر ایم ایم اے کا ہوم ورک ریاستی پشت پناہی سے بننے والی مسلم لیگ نواز گروپ، قائداعظم گروپ یا ایم کیو ایم کی نسبت کچھ زیادہ ہی ہے اور اسے عالمی سطح پر بھی مثبت معروضی حالات ملے ہیں۔ بورژوا پارٹیوں کے مسلسل بحرانی کیفیتوں میں گزرنے کے عمل نے متحدہ مجلس عمل کو ایک بڑی متبادل قوت بنا دیا ہے۔

اس کے مدرسے موجود ہیں، نئی نسل تیار ہو رہی ہے۔ وہ معروضی اور داخلی دونوں انداز میں مثبت صورتحال سے گذر رہی ہے۔ اس لحاظ سے اس معاہدہ کے باوجود ایک قبضہ کے بعد متحدہ مجلس عمل کی جانب سے اپوزیشن کرنے کا ڈرامہ رچائے جانے کو عوامی پذیرائی مل سکتی ہے مگر اس کی مقبولیت ایک خاص حد سے آگے نہیں جا سکتی۔

☆☆☆

''ہم چار ہمارے بارہ''..... یہ آر ایس ایس کا پراپیگنڈا ہے، ڈاکٹر کملا محسن

ارشد علی فخر (جنوری 2004ء)

ڈاکٹر کملا محسن نے ایس این ٹی ویمن یونیورسٹی کے ریسرچ سنٹر ویمن سٹڈیز کے بارے میں بتایا: ''بھارت میں 1975ء میں ہی عورتوں کی سٹڈیز کے مختلف ریسرچ پراجیکٹس کا آغاز ہو گیا تھا اور اسی سال ایس این ڈی ٹی ویمن یونیورسٹی ممبئی میں یہ سنٹر قائم کر دیا گیا جس نے ویمن سٹڈیز میں ماسٹرز کا آغاز کیا جبکہ میں نے ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد اس سنٹر کو جائن کیا''

ڈاکٹر کملا نے اپنی پی ایچ ڈی کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ مجھے اس بات سے ماسٹرز کے دوران میں بہت دلچسپی تھی کہ میں دیکھوں کہ بین الاقوامی مالیاتی ادارے (آئی ایم ایف، ورلڈ بینک، ڈبلیوٹی او) کس طرح کسی ملک کی پاپولیشن پالیسی کو متاثر کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی موضوع پر میں نے پی ایچ ڈی کی اور اپنے تھیسز میں بتایا کہ عالمی مالیاتی ادارے کس طرح کسی ملک کی پاپولیشن پالیسی کیلئے امداد دیتے اور پھر اس امداد کی آڑ میں اس ملک کو متاثر کرتے ہیں۔

کیا بھارت کی غربت کی وجہ وہاں کی مسلم آبادی ہے؟ کے جواب میں ڈاکٹر کملا محسن نے بتایا کہ یہ بات سراسر غلط ہے اور مسلمانوں پر نفسیاتی پریشر ڈالنے کے لیے اس طرح کی افواہیں بغیر تحقیق کے اڑائی جاتی ہیں۔ اس کے پس منظر میں بھارتی مسلمانوں کا ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی روایت کا دخل ہے۔ حالانکہ ریسرچ سے یہ بات بھی غلط ثابت ہو چکی ہے۔

بھارتی مسلمان ایک سے زیادہ شادی نہیں کرتا کیونکہ غربت کی وجہ سے ایک شادی کی اخراجات ہی بڑی مشکل سے برداشت ہوتے ہیں۔البتہ کسی انتہائی ضرورت پر خال خال ہی کوئی مسلم دوسری شادی کرتا ہے۔یہ اصل میں راشٹریہ سیوک سنگھ (آرایس ایس) کا پراپیگنڈا ہے کہ مسلمانوں میں چونکہ شادیوں کا رواج ہے اس لیے مسلمان غریب ہیں اورانکی غربت کی وجہ سے بھارت غریب ہے۔حالانکہ بھارت کچھ اور وجوہات کی وجہ سے غریب ہے۔اس کی سب سے بڑی وجہ غیر ملکی قرضے ہیں۔عوام کے خون پسینے کی کمائی کا پیسہ ملک سے باہر چلا جاتا ہے کیونکہ ہندوستان کو ہر سال ایک زرکثیر غیر ملکی قرضوں کی واپسی اور سود کی واپسی پر خرچ کرنا ہوتا ہے۔جس سے بھارت میں ڈویلپمنٹ کے متعدد پراجیکٹس رک گئے ہیں اور نئے پراجیکٹس شروع نہیں ہو پا رہے۔ابھی حال ہی میں ممبئی میں ورلڈ بنک کے دباؤ پر ٹرانسپورٹ کے کرائے بڑھا دیئے گئے ہیں، جس پر ممبئی کے رہائشی احتجاج کر رہے ہیں۔

آبادی کے بارے میں آرایس ایس کے پراپیگنڈے پر مزید بات چیت کرتے ہوئے ڈاکٹر کملا محسن نے کہا کہ کہ بھارت میں آبادی کی منصوبہ بندی کرنے والے محکمے کا نعرہ ہے ''ہم دو.....ہمارے دو'' جبکہ آرایس ایس والے کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں جا کر یہ نعرہ ''ہم چار.....ہمارے بارہ'' ہو جاتے ہیں کیونکہ بقول آرایس ایس چار شادیوں کے کم از کم بارہ بچے تو پیدا ہوتے ہی ہیں۔پاکستان اور بھارت کی غربت کا موازنہ کرتے ہوئے ڈاکٹر کملا محسن نے بتایا کہ پاکستان کے مقابلے میں بھارت میں زیادہ غربت ہے۔جبکہ پاکستان میں کم ہے۔ممبئی کی کچی آبادیوں کا موازنہ کراچی اور لاہور کی کچی آبادیوں سے کر کے دیکھ لیں یا پھر دہلی اور ممبئی میں رات کو فٹ پاتھوں پر سونے والوں کو موازنہ لاہور اور کراچی میں فٹ پاتھوں پر سونے والوں سے کر کے دیکھ لیں، فرق صاف نظر آئے گا۔بھارت میں غربت کی شرح اور شدت زیادہ ہے۔

کراچی اور ممبئی میں کوئی دلچسپ فرق؟ اس کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر کملا محسن نے کہا کہ کراچی میں کسی سے راستہ پوچھ لیں یا کوئی اور معلومات تو وہ رک کر مختصر اور سیدھا جواب دے

گا جبکہ آپ ممبئی میں کسی سے کچھ پوچھ کر دیکھ لیں تو وہ آپکو الٹا جواب دے گا۔ جہاں تک دونوں شہروں کی مہنگائی کا تعلق ہے تو لاہور کی انارکلی کراچی اور ممبئی دونوں سے مہنگی ہے۔ اگر کراچی اور ممبئی کا موازنہ کیا جائے تو ممبئی میں اشیائے صرف سستی ہیں اور کراچی بہت مہنگا شہر ہے۔ ممبئی میں چائے کا کپ (کٹنگ کپ، یعنی آدھا کپ) اڑھائی روپے میں مل جاتا ہے۔ پان اڑھائی روپے میں مل جاتا ہے۔ جبکہ کراچی اور لاہور میں چائے بھی پانچ روپے کی ہے اور پان بھی پانچ روپے کا۔ تو اس حساب سے یہاں دوگنی مہنگائی ہوئی۔ ممبئی کی نسبت کراچی میں لوگوں کا معیار زندگی اونچا ہے۔ ڈبلیوٹی او کی پابندیوں پر بات چیت کرتے ہوئے ڈاکٹر کملا محسن نے بتایا کہ اس سے بھارت اور پاکستان دونوں کو نقصان ہوگا۔ عوام کو بظاہر یہ محسوس ہوگا کہ فائدہ ہو رہا ہے کیونکہ اشیاء سستی ہونگی، لیکن جب آہستہ آہستہ کارخانے بند ہوں گے تو بے روزگاری بڑھے گی، نوکریاں کم ہوں گی۔ اگر دونوں ملکوں کا موازنہ کیا جائے تو ڈبلیوٹی او کا زیادہ نقصان پاکستان کو ہوگا۔

☆☆☆

اسلامی بنیاد پرستی: طارق علی کی نظر میں

طارق علی سے فاروق سلہریا کی سٹاک ہوم میں گفتگو (فروری 2004ء)

وہ حاضر جواب، وضعدار، شاہانہ، منوا لینے والا، نتیجہ کن، اور روشن خیال ہے۔

جب وہ ٹونی بلیئر کا تمسخر اُڑانے پر اپنے سامعین کو ہنساتا ہے، تو حاضر جواب ہوتا ہے۔

''اس لڑکے نے حماقت کو بدنام کر دیا ہے'' یا پھر، وہ پوچھتا ہے: ''کیا پیوٹن قتلِ عام کی کانفرنس میں آ رہا ہے؟'' نہیں' جواب ملتا ہے۔

بہت خوب۔ ''کچھ تو تسلی ہوئی''

جب وہ روسٹرم ایسے سنبھالتا ہے گویا وہ ابھی بھی آکسفورڈ سٹوڈنٹ یونین کا صدر ہے اور کوئی تقریر کرنے جا رہا ہے، تو وضعدار دِکھتا ہے،

جب وہ اپنے پاکستانی لہجہ سے آکسفورڈ کے گریجویٹ کی طرز میں انگریزی بولتا ہے تو شاہانہ انسان نظر آتا ہے۔

جب وہ ایک اور دنیا کی ممکنات کے دلائل دیتا ہے تو بات منوانے والا محسوس ہوتا ہے۔

جب وہ سامراج کی مخالفت اور اسکے پول کھولتا ہے یہ کہتے ہوئے کہ ''سامراج ہمیشہ اپنے مفاد میں عمل پذیر ہوتا ہے'' تو اسکی بات نتیجہ کن لگتی ہے۔

اور جب وہ مستقبل کے بارے میں بات کرتا ہے کہ ''21 ویں صدی مختلف ہوگی'' تو روشن خیال ہوتا ہے۔

یہ وہ تاثرات تھے جو سڑکوں پر برسرِ پیکار رہنے والے طارق علی نے سٹاک ہوم کے

باسیوں پر چھوڑے، جب اس نے 25 جنوری2004ء کو یہاں Natverket Mot Krig کے زیر اہتمام ایک کانفرنس کو اپنی آمد سے شان بخشی۔ ''میں ۲۵ سال کے بعد سٹاک ہوم واپس آیا ہوں'' وہ یاد کرتے ہوئے کہتا ہے، ''یہ شہر بہت بدل گیا ہے۔ بہت بہتر ہو گیا ہے'' وہ ایک دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ تبصرہ کرتا ہے، سٹاک ہوم کے شہریوں نے اُسے، سرد موسم کے باوجود، ایک گرمجوش استقبال سے نوازا۔ ABF Hus کا یہ ایک کھچا کھچ بھرا ہال تھا جہاں اس نے Alternative Conference پر گفتگو کی۔ Academie Bok Handein میں اُس نے اپنی مشہور کتاب "Clash of Fundamentalism" پر بات کرنا تھی۔ Svenska Dagbladet نے اسکا مضمون شائع کیا۔ کئی صحافیوں نے اسکے انٹرویو لئے۔

دوسروں کے علاوہ، "Internationalen" (سویڈن میں ایک مارکسی ہفت روزہ) نے اسکے ساتھ ایک خصوصی انٹرویو کیا۔ جس میں اُس نے مسائل کی گہری نظر کے ساتھ وضاحت کی۔ اس نے لفظ ''قتل عام'' کے استعمال پر تنبیہ کی۔ اور کہا ''بیسوی صدی میں تین بڑے ''قتل عام'' ہوئے ہیں۔ یورپ میں یہودیوں کا قتل عام، جس میں چھ ملین یہودی ذبح کیے گئے۔ کونگولیز کا قتلِ عام، جب دس سے بارہ ملین کونگولیز، بیلجئم نوآبادی کے دور میں قتل کئے گئے۔ اور حال ہی میں روانڈا میں قتلِ عام ہوا۔

وہ اس مفروضہ کو نہیں مانتا کہ امریکہ کی افغانستان یا عراق میں فوجی مداخلت کسی طور بھی ترقی پسندانہ تھی۔ باوجود اسکے کہ یہ طالبان اور صدام حکومتوں کے خاتمہ کا باعث بنی۔ ''دیرپا اور بہتر تبدیلی وہ ہوتی ہے جو بنیادی طور پر ملک کے اندر ہی سے آتی ہے''۔ اسکا خیال ہے کہ افغانستان اور عراق دونوں میں بدامنی ابھی بھی عروج پر ہے۔ خواتین کو ابھی بھی افغانستان میں کوئی حقوق حاصل نہیں۔ کرزائی طالبان سے نپٹ رہا ہے۔ یاد رہے کہ ''سامراج ہمیشہ اپنے مفاد میں عمل کرتا ہے''۔

مزید گفتگو ملاحظہ ہو!

انٹرنیشنالین: کیا آپ واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی بنیاد پرستی ایک دھمکی کے سوا کچھ نہیں، جو امریکہ نے تخلیق کی، محض اس لیے کہ اسے سوویٹ یونین کے منہدم ہونے کے بعد کوئی دشمن چاہیے تھا؟

طارق علی: کم وبیش تمام مسلم ممالک میں، چند ایک کو چھوڑ کر، اسلامی بنیاد پرستی کو پنپنے میں براہ راست یا دوسری طرح سے امریکہ نے مدد کی۔ کسی بھی ملک میں اسلامی بنیاد پرستی امریکہ کی مدد کے بغیر ایک بڑی طاقت نہیں بنی۔ مصر میں، جب انور سادات نے ''ناصر کی میراث'' کو مٹانا چاہا تو اس نے اسلامی بنیاد پرستوں کو استعمال کیا۔ انکو یونیورسٹیوں میں لایا گیا۔ اسلامی بنیاد پرستوں نے سیکولر اور انتہا پسند طاقتوں کے خلاف خوف ودہشت کی ایک فضا قائم کردی۔

پاکستان میں جنرل ضیاء نے بالکل یہی کیا۔ سعودی عرب میں ایک وہابی بادشاہت ہے جسے امریکہ کا آشیر باد حاصل ہے۔ نہ بھولیں کہ، افغانستان میں، امریکہ نے مذہبی جہاد کا ساتھ دیا، قطع نظر اسکے کہ سوویٹ مداخلت جائز تھی یا نہیں۔ خود میں نے بھی افغانستان میں سوویٹ مداخلت کی مخالفت کی تھی۔ میں نے پیشین گوئی کی تھی کہ افغانستان میں سوویٹ مداخلت ایک ایسی ابتری پھیلا دے گی جسکو درست کرنے میں کئی دہائیاں درکار ہونگی۔ بہت سے لوگوں نے، جنہوں نے افغانستان میں سوویٹ مداخلت کی حمایت کی تھی بشمول پاکستان سے میرے دوست احمد رشید کے، بعد میں امریکہ کی مداخلت کی بھی حمایت کی۔ انہیں اپنے ہی لوگوں پر کوئی یقین نہیں۔

اچھا تو آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ: میرے خیال میں یہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ ہی تھا جس نے سرد جنگ کے دور میں بڑے پیمانے پر اسلامی بنیاد پرستی پھیلانے میں مدد کی۔ اسرائیل کی ہی مثال دیکھ لیجیے۔ حماس کی، اسرائیلی حکومت نے PLO کو پیچھے دھکیلنے کے لیے حوصلہ افزائی کی، عرافات اور جارج حبش جیسے لوگوں کو پیچھے دھکیلنے کے لیے۔ تمام فلسطینی سیکولر رہنماؤں کو پیچھے ہٹانے کے لئے۔ یہ ہمارا مسئلہ نہیں۔ یہ مسئلہ اُنہوں نے پیدا کیا ہے، ہم تو محض اسکے نتائج بھگت رہے ہیں۔

انٹرنیشنالین: کیا آپ نہیں سمجھتے کہ سامراج مخالفت کے بیج پہلے سے ہی اسلامی بنیاد پرستی کی تحریک میں موجود تھے، آپ کے اس دعوے کے برعکس، کہ مسلم بنیاد پرستوں نے سرد جنگ کے بعد سامراج مخالفت نکتہ نظر اپنایا؟۔ مثلاً لبنان میں امریکی اڈوں پر حملہ کو ہی دیکھ لیجیے۔

طارق علی: لبنانی صورتحال بہت مختلف ہے۔ آپ یہاں حزب اللہ کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔ حزب اللہ ایران میں اسلامی انقلاب کے نتیجہ میں بنی۔ حزب اللہ نے ہمیشہ برسرِ عام اعلان کیا کہ وہ اسرائیل کو لبنان سے باہر دھکیل دیں گے۔ یہ ایک مقبول نعرہ تھا۔ غور کریں کہ ایران کے ملاؤں نے بھی عراق کے قبضہ کی حمایت کی تھی۔ اسی طرح پاکستان میں بھی جماعتِ اسلامی نے 60's، 70's اور 80's میں امریکہ کی حمایت کی تھی۔ اب اگر وہ سامراج مخالف بننے کی کوشش میں ہیں تو میں نہیں مانتا کہ وہ پہلے سے سامراج مخالفت کر رہے ہیں، اب وہ امریکی سامراجیت کے خلاف برسرِ پیکار ہیں تو یہ انکا اپنا قصور ہے۔ امریکہ کے خلاف، ایک حقیقی سامراج مخالف جنگ، شعوری آگہی کی حمایت اور حوالے کے ایجنڈا سے ہی ممکن ہے۔ جو بنیاد پرست کرنا چاہ رہے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ نویں صدی کے اسلام، جس کو بھی وہ صحیح طرح سے نہیں سمجھتے، کی طرف واپس لوٹ جائیں۔

سیکولر اور کیمونسٹ طاقتوں کے زوال کے بعد صرف مذہبی پارٹیاں ہی سامراجیت کے خلاف کام کرنے کے لیے رہ گئی تھیں۔ سیکولر سے میری مُراد، مصری حکومت نہیں، جو سیکولر ہونے کا دعویٰ تو کرتی ہے مگر امریکہ کی جھولی میں بیٹھی ہے۔

انٹرنیشنالین: مگر کیا آپ نہیں سمجھتے کہ یہ نیا منظر نامہ دراصل، Huntington کے ''تہذیبوں کے ٹکراؤ'' کی تصدیق کرتا ہے اور آپ اسے بوسنیا سے چیچنیا اور افغانستان سے عراق تک دیکھ سکتے ہیں، مسلم دنیا ہر جگہ زیرِ عتاب آ رہی ہے۔

طارق علی: آپ دیکھیں کہ امریکہ نے بوسنیا کی حمایت کی ہے۔ UNO نے مداخلت کی۔ اُسامہ کے بہت سے ساتھی بوسنیا ہوائی جہاز سے بھجوائے گئے جو امریکی فوجیوں کے شانہ بشانہ لڑے۔ کوسوہ کی مثال دیکھیں۔ مغربی دنیا مسلمانوں کی طرف تھی۔ کیا یہ ''تہذیبوں کی لڑائی'' ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ: شمال اور جنوب کی ایک دیرینہ جنگ ہے۔ لاطینی امریکہ کی مثال لے لیجیے۔ سامراجی پالیسیوں کے نیولبرل ایجنڈے کے خلاف مزاحمت جاری ہے۔ لاطینی امریکہ میں 9/11 کو سرِ عام جشن منایا گیا۔ تہذیبوں کے ٹکراؤ کا مفروضہ بکواس ہے۔ دلچسپی کی بات یہ ہے، کہ یہ نظریہ مسلم دنیا میں اسلامی بنیاد پرستوں کے بہت اچھی طرح سے کام آتا ہے۔

انٹرنیشنالین: آپ اسکو شمال جنوب کی تقسیم کہتے ہیں اور لاطینی امریکہ کی مثال دیتے ہیں مگر مسلم دنیا اپنی مزاحمت، بجائے لاطینی امریکہ جیسی طبقاتی کشمکش اور شورش کے، اسلامی بنیاد پرستی کے ذریعہ کیوں سامنے لائے؟

طارق علی: میرا خیال ہے کہ وہ سامنے لائیں گے۔ اسکو شاید دس بیس سال کا عرصہ لگے۔ اسطرح کی مزاحمتیں ہوتی رہی ہیں۔ انڈونیشیا میں پاکستان میں، ہر جگہ۔ جب سوشلسٹ نظریات باقی دنیا میں مقبول تھے، تو یہ نظریات مسلم دنیا میں بھی مقبول تھے۔ ایسی مزاحمتیں بے رحمی سے کچل دی گئیں۔ انڈونیشیا میں بھی دنیا کی سب سے بڑی کمیونسٹ پارٹی ہوا کرتی تھی۔ اسکو سوہارتو کے دور میں، سامراج کی مدد کے ساتھ کچل دیا گیا۔ پاکستان میں، مزدوروں اور کسانوں کی تحریک کو کچل دیا گیا۔ اُس وقت کے وزیرِ اعظم کو پھانسی چڑھا دیا گیا۔ اسی طرح عراق میں، صدام حُسین نے بہت سے کمیونسٹوں کو مار ڈالا تھا۔ مصر میں سادات نے یہی کیا۔ بحر حال، ان طاقتوں کی تباہی کسی حد تک اس صورتحال کی ذمہ دار ہے۔

انٹرنیشنالین: آپ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ اسلام کو سامراج کے خلاف ہمیشہ ایک ہتھیار کے طور پر ہی استعمال کیا گیا ہے؟ یہاں تک کہ، ناصر، بھٹو، یا قدافی جیسے سیکولر لیڈروں نے بھی، اس معاملے میں، اسلام پر ہی انحصار کیا۔ کیوں؟

طارق علی: میں نہیں سمجھتا کہ ناصر اسلام کا نعرہ استعمال کرتا رہا ہے۔ اس کی تمام اہم تقاریر سنیئے۔ اگر آپ انکا مطالعہ کریں تو آپکو اسلام کا استعمال نظر نہیں آئے گا۔ اسنے عرب قومیت کا نعرہ استعمال کیا۔ ''عرب ایک قوم ہیں'' یہ تھا جو اُس نے کہا۔ بھٹو اسلام کو ورغلانے کے لیے استعمال کیا کرتا تھا۔

انٹرنیشنالین: آپ کا کیا خیال ہے کہ ایک جمہوری عمل کی لہر اسلامی دنیا میں ایک خوشگوار تبدیلی ہوگی؟

طارق علی: ہاں۔

انٹرنیشنالین: اگر سعودی عرب میں اُسامہ جیسے لوگ اور مصر میں مسلم بھائی چارہ آجائے تو پھر

طارق علی: یہ وہ بات ہے جسے امریکی جمہوریت کا خلاف کہتے ہیں۔ اگر آپ ایک ایسی حکومت منتخب کرتے ہیں جسے آپ ناپسند کرتے ہوں تو یہ ایک مسئلہ ہے۔ مغرب میں سامراجیت کے لیے، یہ کوئی مسئلہ نہیں جہاں مرکز، بائیں مرکز یا دائیں مرکز کا ایک ہی نیولبرل معاشیاتی ایجنڈا ہوتا ہے اور زیادہ تر تمام سیاسی پارٹیاں امریکہ کے سامراجی رویہ کی حمایت کرتی ہیں۔

اُن کا مشترکہ اعلامیہ ہے: سرمایہ کی حفاظت۔

لیکنِ دنیا کے مختلف حصوں میں، ایسا نہیں ہے۔ مثلاً اگر عراق میں انتخابات ہوتے ہیں تو شیعہ پارٹی ہی کیوں جیتے گی؟ اس لیے کہ شیعوں کو پچھلے بیس سالوں سے اسلحہ اور سرمایہ مہیا کیا جا رہا ہے، تاکہ وہ صدام حُسین کے خلاف مخالفت تشکیل دے سکیں۔ ھاں، اگر انتخابات کے نتیجہ میں، شیعہ پارٹی جیتتی ہے تو اسے برسرِ اقتدار آنے دیں۔ لوگ خود فیصلہ کریں۔

ایران میں، اسلام کے تیس سالہ طرزِ عمل کے بعد، تمام نوجوان ملاؤں سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ اسلام سے پہلے کے دور کو دریافت کر رہے ہیں۔ میری کتابوں کو پڑھنے کی وجہ سے نہیں بلکہ انکے اپنے تجربات کی وجہ سے۔ اگر عراقیوں نے شیعوں کو ہی ووٹ دینا ہے تو انہیں دینے دیں۔ اگر سعودی، وہابیوں کو منتخب کرنا چاہتے ہیں تو کریں۔ اگر مسلم بھائی چارہ والے، مصر میں، انتخابات کے نتیجہ میں، حکومت تشکیل دینا چاہتے ہیں تو کرنے دیں۔ لوگ خود ہی سیکھ جائیں گے۔

انٹرنیشنالین: مگر کیا آپ برطانیہ میں انتخابات کی حمایت کریں گے اگر اس کے نتیجہ میں 'فسطائی' Fascist برسرِ اقتدار آجائیں؟

طارق علی: ہم فسطائیت کی بات نہیں کر رہے۔ وہ غلطی نہ کریں جو بہت سے لوگ ۱۱ ستمبر کے بعد کر رہے ہیں یہ کہ یہ اسلامی فسطائیت تھی۔ وہ فسطائی نہیں ہیں۔ یہ ایک درست مماثلت نہیں۔ ان

پارٹیوں کی مختلف امتیازی صفات ہیں۔ یہ اس لیے موجود ہیں کیونکہ کوئی اور موجود نہیں۔ جب لوگ نیولبرل پالیسیوں کے خلاف لڑ رہے ہوں اور بنیاد پرستوں کے علاوہ کوئی اور متبادل نہ ہو، تو لوگ کہاں جائیں؟ کیا NGO's میں بھرے ہوئے موٹی تنخوا ہوں والے بائیں بازو کے دانشوروں کے پاس؟ مسلم دنیا میں ہر طرف، بائیں بازو کے لوگ NGO's میں ڈوبے ہوئے ہیں، حقیقت سے مکمل منقطع ہو کر۔

میرے کہنے کا محض یہ مطلب ہے کہ آپ کے پاس کیا متبادل ہے؟ میرے خیال میں بہتر ہے کہ آپ انتخابات کروائیں اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کون حکومت کرتا ہے۔ ایک مرتبہ اگر لوگ یہ سمجھ لیں کہ انہیں حکومت کو تبدیل کرنے کا حق ہے، تو وہ بہتر پارٹیوں کا انتخاب کرنا سیکھ جائیں گے۔ دیکھیے، حکومتیں بدلنے کے دو طریقے ہیں۔ انقلابات یا انتخابات۔ اگر عوام انتخابات سے حکومتیں بدل سکیں تو وہ اپنی غلطیوں سے سیکھ لیں گے۔

انٹرنیشنالین: آپ بنیاد پرستی اور فسطائیت میں کیسے تفریق کریں گے؟ وہ بھی جبکہ دونوں میں بہت سی قدریں مشترک ہوں۔

طارق علی: یہ دونوں مختلف ادارے ہیں۔ اسلامسٹ مختلف ممالک میں مختلف ہیں۔ عراق میں وہابی شیعوں سے مختلف ہیں۔ طالبان ایران کے ملاؤں سے الگ طرح کے ہیں۔ ان کو ملانے والا اعتقاد یہ ہے کہ قرآن کے اندر ہی معاشرے کو منظم کرنے کے لیے ایک متبادل نظام کے جراثیم موجود ہیں۔ یہ غلط ہے۔ ایران کو دیکھیں، کیا یہ مستقبل کا راستہ ہے؟

جہاں تک بنیاد پرستی اور فسطائیت میں مشترک اقدار کا تعلق ہے، تو فسطائیت اور سٹالنسٹوں (Stalinists) میں کس قدر مشترکہ ہیں۔ آپ ایک Stalinist پارٹی کو ایک فسطائیت پارٹی نہیں کہیں گے کیوں کہ اس میں فسطائیت کی کچھ مشترکہ اقدار ہیں۔

انٹرنیشنالین: یہ کیا وجہ ہے کہ مغربی دنیا کو اسلامی بنیاد پرستی پر تو تشویش ہوتی ہے مگر ہندو بنیاد پرستی یا عیسائی بنیاد پرستی انہیں کچھ نہیں کہتی؟

طارق علی: ہندو بنیاد پرستی عالمی نہیں جبکہ عیسائی بنیاد پرستی کو یہاں مغرب میں طاقتور طبقہ پسند کرتا ہے۔

☆☆☆

مودودی، جماعت اسلامی اور دوغلہ پن

شاہد محمود (مارچ 2004ء)

مولانا مودودی کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں دسمبر 2003ء کو جماعت اسلامی کے زیر اہتمام ایوان اقبال لاہور میں ایک سیمینار کا اہتمام کیا گیا، جس میں مولانا مودودی کی تعلیمات کی روشنی میں پاکستان کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے بڑے بڑے دعوے کئے گئے۔ کچھ دن بعد سرحد حکومت نے تعلیمی سلیبس میں مولانا مودودی کی تعلیمات کو شامل کرنے کی قرار داد پیش کی۔ جس کو اسمبلی میں قبول کرلیا گیا۔ سیمینار تو ہوگیا لیکن اس حوالے سے بہت سے سوالات کے جوابات باقی ہیں۔

مولانا مودودی جماعت اسلامی کے بانی ہیں اور جماعت اسلامی آج (MMA) کی شکل میں سامراج مخالف نعروں کے ساتھ ووٹ لے ایک صوبہ میں کرپاور میں ہے۔ آیئے! مولانا مودودی کے نظریات و عمل اور زندگی پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

مولانا مودودی 1903ء میں حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ والد کی ملازمت ختم ہونے پر ان کا کنبہ آبائی شہر دہلی آ گیا۔ مولانا مودودی کے والد کی وفات پر سلسلہ تعلیم بند ہوگیا اور وہ تلاش معاش کے لیے شعبہ صحافت سے منسلک ہوگئے۔ 1924ء میں جمعیت علماء ہند کے اخبار ''الجمعیت'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا 1933ء میں ''ترجمان القرآن'' رسالے سے وابستہ ہوگئے۔ 1938ء میں پٹھانکوٹ کے ایک مذہبی سکول سے وابستہ رہے۔ 1941ء میں مولانا مودودی نے مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کی مخالفت کے لیے پٹھان کوٹ کے نزدیک ایک مسلمان زمیندار کی

سرپرستی میں قائم کردہ اپنی درس گاہ میں اپنی جماعت اسلامی کے نام سے ایک سیاسی تنظیم قائم کی۔

14 اگست 1947ء کے بعد مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عمل شروع ہوا تو مولانا مودودی نے اپنے دوستوں کے ہمراہ لاہور آ کر پناہ لی۔ مولانا مودودی نے جب جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی تو اس نے اسی دن اپنے پیش کردہ نظریہ کی نفی کی۔ کیونکہ مودودی کی نظر میں مسلمان خود ایک جماعت کی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے وہ اس کے اندر مزید تقسیم، امتیاز پیدا کرنا یا مسلمانوں کو پارٹیوں میں تقسیم کرنا دراصل وہ مسلمانوں کو کمزور کرنے کی سازش تصور کرتے تھے۔ جماعت اسلامی کا قیام خود مودودی کی گذشتہ تعلیمات کی نفی تھی۔ مولانا مسلمانوں کی سیاسی جماعت بنانے کے خلاف تھے۔ وہ وطنی قومیت کے خلاف تھے۔ البتہ خود مولانا نے مسلمانوں کی تقسیم کرنے کی سازش جماعت اسلامی کی صورت میں کی۔ مودودی کی جماعت اسلامی تقسیم ہند تک قومی آزادی کی تحریک کی مخالفت کرتی رہی۔ پاکستان کے وجود کے بارے میں مولانا مودودی کو انتہائی افسوس تھا۔ قرارداد پاکستان کے بارے میں مودودی نے لکھا کہ "جب میں مسلم لیگ کے ریزولیوشن قرارداد پاکستان کو دیکھتا ہوں تو میری روح بے اختیار ماتم کرنے لگتی ہے"۔ جماعت اسلامی کے بانی کی یہی جماعت اسلامی جو آج ایل ایف او (LFO) اور جمہوریت کی علمبردار کی حیثیت سے میدان میں آئی ہے، اس کے بانی مودودی پاکستان اور اس میں جمہوری نظام کے قیام کی کھل کر مخالفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں "کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمان کی کافرانہ حکومت ہوگی"۔ اسکی رائے یہ تھی کہ ہندوستان کے مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان ہی نہیں ہیں اس لیے کوئی تحریک اور کوئی جماعت ان کی ہمدردی مستحق نہیں۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ یہ لوگ از نو مسلمان بنیں۔ تو اس کی امداد کے مستحق ٹھہریں گے۔ مولانا اپنی ذات کے علاوہ برصغیر کے مسلمانوں کو مسلمان ہی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ایک طرف تو مولانا کسی بھی قومی حکومت کے خلاف تھے اور پوری دنیا میں حاکمیت قائم کرنے کا متمنی تھا اور دوسری طرف وہ کھلم کھلا کہتا تھا کہ

اسے ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی معاشرتی ومعاشی حقوق ومفادات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ شخص بہت ہی اقتدار پسند اور جاہ وحشمت کا شیدائی تھا۔ یہ اپنے ہی تعمیر کردہ نظریات کے احصار میں تھا جو کسی بھی صورت میں اس سے باہر دیکھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

1946ء میں لکھتے ہیں کہ اگر مشرقی پاکستان کی ایک الگ ریاست بنتی ہے۔ تو وہاں خالص اسلامی نظام نافذ کرنے میں مشکلات پیش ہوں گی کیونکہ وہاں غیر مسلموں کی آبادی کا تناسب اب بھی 25 فیصد ہے۔

1947ء میں پاکستان آکر پناہ لینے کے بعد مولانا نے مسلمان نوابوں، تعلق داروں، جاگیرداروں اوزمینداروں میں اپنا مقام بنانے کی ہر ممکن کوشش کی اور یہ طبقہ اس کے نظریات کی تشہیر کے لیے اسے فراخدلانہ مالی وسائل کے علاوہ دوسری بہت سی سہولتیں مہیا کرتے تھے اور مولانا ان کے مفادات کے تحفظ کے لیے بنیاد مہیا کرتا تھا۔ اور اسی طبقے نے مولانا مودودی کو لاہور کے لاء کالج میں لیکچرار کا بندوبست کیا۔ مولانا مودودی معاشی امور میں مساوات کا قائل نہیں تھا۔ ان کے خیال کے مطابق خدا کی بنائی ہوئی فطرت خود اس بات کی متقاضی ہے کہ ''انسان کے درمیان رزق میں تفاوت ہو''

وہ اس بات کے قائل تھے کہ جو شخص موٹر لیے ہوئے آیا ہے وہ موٹر ہی پر چلے اور جو شخص دو پاؤں پر آیا ہے وہ پیدل ہی چلے اور جو لنگڑا پیدا ہوا ہے وہ لنگڑا ہی چلے۔ جاگیرداری نظام کے تحفظ کے لیے نظریاتی بنیاد مہیا کرتے ہوئے مودودی نے کہا کہ اسلام دوسری تمام ملکیتوں کی طرح زمین پر انسان کی شخصی ملکیت تسلیم کرتا ہے۔ زمین بھی ایک آدمی کی ملکیت ہو سکتی ہے اس کے لیے کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ ''ایک گز مربع سے لے کر ہزار مربع ایکڑ تک خواہ کتنی ہی زمین ہو اگر کسی قانونی صورت سے آدمی کی ملکیت میں ہے تو بہر حال وہ اس کی جائز ملکیت ہے۔'' مولانا مودودی لونڈی اور غلام کے بارے میں کہتے ہیں کہ نظام شریعت میں جنگی قیدیوں کو لونڈی غلام بنانے کی اجازت ہے۔ غلاموں کی خرید وفروخت ہو سکتی ہے اور لونڈیوں سے جنسی تعلقات قائم کئے جا سکتے ہیں۔

لونڈیوں کی تعداد کی کوئی قید نہیں۔ مولانا فوٹو گرافی کے پیشے کو حرام قرار دیتے ہیں۔

مودودی نے کشمیر پر فتویٰ جاری کرتے ہوئے کہا تھا کہ کشمیر میں جہاد ہم پر فرض نہیں۔

مودودی اور ان کی جماعت نے اپنی ہی تعلیم اور نظریات کی نفی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مودودی نے ہمیشہ جاگیردار طبقے کو مذہبی تحفظ مہیا کیا۔ اس طرح جاگیردار طبقے نے محنت کش طبقے کے استحصال کے لیے مذہب کو بطور ہتھیار استعمال کیا۔ مولانا خواتین کو ایک بکاؤ چیز بنا کر پیش کرتے ہیں، جس میں پیسے کے ذریعے عورت کو کسی بھی بکاؤ چیز کی طرح خریدا اور فروخت کیا جاسکتا ہے۔ جماعت اسلامی بھی اپنے بانی کی تعلیم کی طرح دن بدن بدلتی ہے۔ جماعت اسلامی نے جہاد کشمیر کے نام پر (جس کو ان کا قائد مسلمانوں کے لیے کسی بھی صورت میں جائز قرار دینے کے لیے تیار نہیں تھا) اربوں روپے جہاد فنڈ کے لیے لوگوں سے اکٹھے کیے۔ تو دوسری طرف یہ دیکھ کر محنت کش طبقے کی ہمدردی حاصل ہو جاگیرداری کے خاتمے کے نعرے کے ساتھ میدان میں آئی۔ اور کبھی اپنے دوست سامراج کے خلاف نعرے کے ساتھ، عوام کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کرتی نظر آتی ہے اور دو صوبوں میں حکومت بنانے میں کامیاب بھی ہو جاتی ہے اور وہی جمہوریت جس کو مولانا صاحب کافرانہ عمل کہتے نہیں تھکتے تھے، اس جمہوریت کو بچانے کا راگ گاتی ہے۔ مودودی اپنی پوری زندگی میں حلیف سامراج اور جاگیرداروں کے ساتھ مل کر بھی پوری کوشش اور قوت کے باوجود پاکستان کی عوام کی ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اگر وہ کسی طبقے کی ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب ہو، تو وہ صرف وہ محدود استحصالی طبقہ جاگیردار، بیوروکریٹ اور ملٹری کی ہمدردی حاصل کر سکا جس نے اس کے لیے اپنے تمام وسائل وقف کر رکھے تھے

مولانا کی تعلیمات تضاد اور منافقانہ مرکبات کا ایک ایسا چوچو کا مربع تھا کہ کسی بھی طرح معاشرے کی اصلاح میں مدد نہیں ملتی بلکہ اس طبقاتی اور استحصالی نظام اور معاشرے میں بنیاد پرستی مضبوط کرنے محنت کش طبقے کو ان کے ظلم و ستم میں جھونکنے اور مذہبی بنیاد پر استحصال کرنے کی بنیاد مہیا کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

☆☆☆

''پہاڑی طوفان'' اور قبائلی علاقوں میں فوج کشی

مذہبی جنونیت کو جڑ سے نہیں اکھاڑ سکتی

مشرف حکومت موجودہ امریکی خارجہ پالیسی کا تسلسل ہے

فاروق طارق (مارچ 2004ء)

امریکی وزیر خارجہ کولن پاول کی 17 مارچ آمد سے قبل قبائلی علاقوں میں ''دہشت گردوں'' کے خلاف آپریشن تیز کر دیا گیا ہے۔ 16 مارچ کو ایک واقعہ میں سرکاری اطلاعات کے مطابق 32 افراد ہلاک ہوئے، جن میں آٹھ پاکستان کی افواج سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سے صرف ایک روز قبل جنرل پرویز مشرف نے پشاور میں ایک ''نمائندہ جرگہ'' سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ قبائلی علاقوں میں 600 سے زائد ''غیر ملکی دہشت گرد'' ہیں۔ یہ غیر ملکی اپنے ملک جا کر جو مرضی کریں ہمیں چھوڑ دیں۔ ہتھیار ڈال دیں تو کسی کے حوالے نہیں کریں گے۔

پاکستان میں اس تازہ ترین فوجی کارروائی کے ساتھ ساتھ افغانستان سے امریکی افواج نے اپنے تازہ افغان بھرتیوں کے ساتھ مل کر ''پہاڑی طوفان'' کے نام سے ایک بڑا آپریشن شروع کر دیا ہے اس کارروائی میں ساڑھے تیرہ ہزار فوجی حصہ لے رہے ہیں یہ آپریشن صوبہ پکتیکا میں جاری ہے۔

پاکستان اور افغانستان نے اس دفعہ زیادہ منصوبہ بندی کر کے امریکی افواج اور اس کی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے ساتھ مل کر مشترکہ حملہ کیا ہے۔ پاکستان میں احمد زئی قبائل کی 18 اقوام پر مشتمل قبائلی جرگہ کو وارننگ دی گئی ہے۔ پاکستانی حکومت نے ہوشیاری کے ساتھ مقامی سطح پر

600 سے زائد افراد پر مشتمل ایک قبائلی لشکر تشکیل دیا ہے۔اس لشکر کی تشکیل کو میجر جنرل شوکت سلطان نے قبائلی روایات کے عین مطابق قرار دیا ہے۔اس قبائلی لشکر کے بنانے کا مقصد صاف واضح ہے کہ قبائلی علاقوں میں جانی نقصان بھی دونوں طرف مقامی افراد کا ہو۔یہ انگریز نوآبادیاتی آقاؤں کی ہدایت اور روایات کے عین مطابق ہے۔''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' مشرف حکومت اسی پالیسی کے تحت بار بار جرگے منعقد کر رہی ہے۔کچھ قبائلی سرداروں کو''ترقیاتی منصوبوں'' کے نام پر خریدا جا رہا ہے۔جنرل مشرف نے بذات خود 15 مارچ کو ان کے سرداروں سے پشاور میں خطاب کیا جس کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ حکومت سے تعاون میں ان کی سلامتی ہے ورنہ وہ فوجی کارروائی کے لیے تیار ہو جائیں۔جنرل پرویز مشرف نے وانا میں 13 بے گناہ افراد کے مارے جانے پر افسوس کا اظہار کیا۔یہ حکومت کی جانب سے''فرینڈلی فائر'' تھا مگر اس افسوس کے ساتھ جنرل مشرف نے انہیں مستقبل میں ہونے والے ایسے ہی واقعات کے بارے میں متنبہ کر دیا کہ اگر تعاون نہ ہوا تو ایسے مزید واقعات ہو سکتے ہیں۔

جنرل مشرف نے اپنے اس اہم اور نظریاتی طور پر تیار شدہ خطاب میں مذہبی انتہا پسندوں کے نقطہ نظر کو رد کرنے کے لیے بے شمار مثالیں دیں اور اسلام کے لیے میانہ روی پر مشتمل پیغام کو سمجھانے کی کوشش کی۔جنرل پرویز مشرف نے مثالیں دے دے کر قبائلی سرداروں کو سمجھا یا کہ ان پر مغربی دنیا اور میڈیا کا بہت پریشر ہے اور یہ کہ اگر تعاون کریں گے تو یورپین یونین اور امریکی حکومت زیادہ رقم دیں گے۔جنرل مشرف نے کہا''ایک ارب ڈالر کی امداد سے ہماری ٹیکسٹائل بڑھی ہیں اور یہ مراعات ہمارے کام کی وجہ سے دی گئی ہیں''

یہ کیا کام تھا جس سے امریکی یورپین سامراج خوش ہو رہا ہے۔امریکی صدر جارج بش کے مطابق جنرل مشرف ہماری امیدوں سے زیادہ تعاون کر رہا ہے۔یہ کام پاکستان کے قبائلی علاقوں میں فوج کشی کرنا اور اسامہ بن لادن، ملا عمر اور گلبدن حکمت یار کو پکڑنے کے لیے تمام وسائل کو بروئے کار لانا۔

پاکستانی افواج اگر کسی بارڈر پر کوئی کام نہ کر رہی ہے تو اس کے پاس اپنے اتنے بڑے

ڈھانچہ کو برقرار رکھنے کا جواز فراہم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پاکستان کے دو ہمسائے ممالک ہندوستان اور افغانستان ہیں۔ پہلے پاکستانی افواج جرنیلوں کے حکم پر ہندوستانی سرحدوں پر ''کشمیر کی آزادی'' کے نام پر موجودہ ''دہشت گردوں'' کی پوری مدد کر رہی تھیں اور خود بھی بعض اوقات کارروائیوں میں شریک ہوتی تھیں اب یہ ''مجاہد'' دہشت گرد قرار پائے ہیں کیونکہ امریکی سامراج انہیں ان القابات سے نواز رہا ہے اور اب ان ''دہشت گردوں'' کے خلاف افغانی سرحد پر کارروائی ہو رہی ہے۔

ایک ہمسایہ ملک سے دوستی کا راگ بڑھ چڑھ کر الاپا جا رہا ہے اور دوسرے ہمسایہ ملک کی سرحدوں پر فوجی کارروائی جاری ہے۔ اگر وہاں سے تھوڑی فراغت مل گئی اسامہ یا کوئی اور پکڑا گیا تو پھر فوجی جرنیل کسی نہ کسی اور بہانے اپنی فوج کو سمندر کے کنارے لگانے کو تو رہے وہ کسی ہمسایہ ملک کے ساتھ ہی کسی متنازعہ میں اپنا ''قومی کردار'' ادا کریں گے۔

جنرل پرویز مشرف نے 15 مارچ کے خطاب میں یہ بجا طور پر کہا کہ پاکستانی افواج ڈیڑھ سو سال بعد قبائلی علاقوں میں داخل ہوئی ہیں۔ امریکی سامراج کو خوش کرنے کے لیے پاکستان کی سامراج دوست حکومت نے سابقہ تمام روایات کو توڑتے ہوئے قبائلی علاقوں کی خود مختاری اور نام نہاد آزادی کو کھلے بندوں روند ڈالا اور یہاں کے معاملات کو براہ راست اپنے کنٹرول میں لے لیا۔

16 مارچ کو وانا کے علاقہ میں اعظم وارسک میں فرنٹیئر کنسٹبلری (FC) کے آٹھ افراد اور 24 مقامی و غیر ملکی افراد کی ہلاکت سے معاملہ کی سنگینی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مقامی شاہدین کے مطابق ہلاک ہونے والوں کی تعداد سرکاری طور پر بتائی جانے والی تعداد 32 سے کہیں زیادہ ہے۔ ایک شخص کے مطابق انہوں نے بڑی تعداد میں لاشیں فوج کے ایک ٹرک میں جاتے دیکھی ہیں۔ درجنوں افراد لاپتہ ہیں۔

قبائلی علاقوں میں فوجی آپریشن کی تیزی کی ایک فوری وجہ امریکی وزیر خارجہ کا دورہ پاکستان ہے جن کو اپنی کارکردگی دکھانا ضروری تھی۔ اس سے پہلے برطانوی وزیر خارجہ کی پاکستان آمد کے موقعہ پر بھی ایسی ہی کارکردگی کا ''خوبصورت'' مظاہرہ ہوا تھا۔

دوسری اہم وجہ امریکی انتخابات ہیں، جہاں امریکی صدر بش کو ڈیموکریٹک پارٹی کے صدارتی امیدوار جان کیری کے ہاتھوں شکست کا سامنا نظر آرہا ہے۔ بش انتظامیہ اپنی صدارتی مہم کا نقطہ عروج اِسی خارجہ پالیسی کا بنا رہا ہے اور خارجہ پالیسی میں ''دہشت گردی'' کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا اس کی بنیاد ہے۔ صدام حسین کے پکڑے جانے کے بعد اب اسامہ بن لادن کا پکڑا جانا ضروری ہے، لہٰذا پاکستان کی حکومت کی مدد سے آپریشن ضروری ہے۔

ادھر پاکستانی صدر مشرف کو بھی یہ بخوبی علم ہے کہ اگر صدر بش ناکام ہوتا ہے تو اس کے ساتھ امریکی انتظامیہ کا موجود انتہائی مثبت اور دوستانہ رویہ اور ترجیحات تبدیل ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا وہ بھی اپنے ذاتی دوست جارج بش کو جتوانے کے لیے بڑی کارروائیاں کر رہا ہے۔ اس کے لیے یہ اب اہم نہیں رہا کہ اس کے پاکستان کے عوام یا علاقہ پر کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ جنرل مشرف کی موجودہ کارروائیاں امریکی خارجہ پالیسی کا تسلسل ہیں۔ ایسے معلوم ہو رہا ہے کہ امریکی وزیر خارجہ کے احکامات کی کھل کر تعمیل ہو رہی ہے۔

جنرل مشرف نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا کہ ان پر حملہ لیبیا سے تعلق رکھنے والے ایک فرد نے کرایا، جس نے پاکستانیوں کو 15/2 لاکھ روپے دیئے لیبیا کا یہ شخص کس کے اشارے پر کام کر رہا ہے؟ یہ جنرل مشرف کو معلوم نہیں۔ جنرل مشرف حکومت اب ان پاکستانیوں کو ٹیلی ویژن پر لانے کی تیاریاں کر رہی ہے، تاکہ اسلامی مذہبی جنونی قوتوں کی جانب سے مشرف کو ہلاک کرنے کے منصوبہ اور سازش کو بے نقاب کیا جا سکے۔ موجودہ واقعات سے قبل جب بھی پاکستان میں کوئی دھماکہ کسی بھی وجہ سے ہوتا تھا، تو اس کا براہ راست الزام انڈین انٹیلی جنس کو دینا ایک فیشن بن گیا تھا مگر اب صورتحال تبدیل شدہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ جنرل مشرف کی حکومت کی جانب سے مذہبی جنونی قوتوں پر حملوں، گرفتاریوں اور ہلاکتوں پر ترقی پسند قوتوں کا کیا نقطہ نظر ہونا چاہیے؟ اور کیا جبر سے مذہبی جنونیت کا خاتمہ ممکن ہے؟

واضح ہے مذہبی جنونیت کو ریاستی پشت پناہی سے فروغ دیا گیا، مگر کسی متبادل ایسی قوت کی عدم موجودگی میں، جو محنت کش طبقات کی حقیقی نمائندگی کر رہی ہے یہ مذہبی قوتیں عام سطح پر بھی سیاسی حمایت لینے میں کامیاب ہوگئیں۔ جس میں ان کی اینٹی سامراج بڑھک بازی کا عمل دخل تھا۔ ریاستی سطح پر جبر کے ذریعے انہیں ختم کرنے کی کوشش وقتی طور پر کامیاب ہوسکتی ہیں، مستقل طور پر نہیں۔ مذہبی جنونیت ایسی صورت میں ابتدائی پسپائی کے بعد نئی اور عجیب وغریب شکلوں میں سامنے آسکتی ہیں۔ جب تک مذہبی جنونی قوتوں کے انفراسٹرکچر اور ماخذ یعنی مدراس اور تعلیم و تربیت کے دیگر اداروں میں مذہبی تعلیم سرکاری سرپرستی میں چلتی رہے گی، مذہبی جنونیت کی جڑیں پھلتی پھولتی رہیں گی۔ جنرل مشرف حکومت کی نظریاتی بنیاد پر مذہبی کی مخالفت نہیں کر رہی بلکہ فوری معاشی مفادات اور سیاسی بقاء کے لیے ان کے خلاف اقدامات کر رہی ہے۔ یہ ردعمل ہے۔ جنرل مشرف کوئی نظریاتی جنگ نہیں لڑ رہا۔ لہٰذا جیسے ہی اس کے فوری مفادات پورے ہوں گے، وہ اس جنگ سے اپنے ہاتھ کھینچ سکتا ہے۔

مذہبی جنونیت کے سیاسی نظریات انتہائی رجعتی اور محنت کش طبقات کو تقسیم کرنے والے ہیں۔ یہ محنت کش عوام کو متحد کرنے کی بجائے مذہبی بنیادوں پر تقسیم کرتے ہیں۔ یہ مذہبی فرقہ واریت کی بنیاد پر حمایت جیتتے ہیں۔ ان قوتوں کے پاس محنت کش عوام کے معاشی مسائل حل کرنے کوئی فارمولا نہیں۔ وہ سرمایہ داری نظام کی کرپشن پر حملے کرتے ہیں مگر متبادل صرف ''ایماندار قیادت'' کا تصور پیش کرتے ہیں۔ موجودہ سرمایہ داری نظام میں محنت کش طبقہ اس لیے غریب نہیں کہ کوئی کرپٹ سرمایہ دار اسے چلا رہے ہیں۔ پاکستان کا سرمایہ داری نظام عالمی اجارہ دار کمپنیوں کے کنٹرول میں ہے۔ نج کاری، ڈاؤن سائزنگ، ری سٹرکچرنگ، ٹیکس لگانے، سرمائے کی کھلی آمدورفت، قرضہ جات، تجارتی سرحدوں کو کھولنا، انٹلیکچوئل پراپرٹی رائٹس وغیرہ، چند ایسی پالیسیاں ہیں جو غربت اور بے روزگاری کی خلیج کو بڑھا رہی ہیں۔ یہ کام کوئی ایماندار کرے یا کرپٹ، اس میں کوئی خاص بنیادی فرق نہ پڑے گا۔ ترقی پسند قوتیں مذہبی جنونی قوتوں کے اس لیے خلاف نہیں ہیں کہ وہ مذہبی ہیں۔ مذہبی

ہونا یا نہ ہونا ہر شخص کا اپنا انفرادی فعل ہے۔ مگر مذہبی جنونی، مذہبی جنونیت کو ایک سیاسی نظریہ بنا کر عوام کی حمایت جیتنا چاہتے ہیں۔ جنرل مشرف کی حکومت اور ماضی حکومتیں اپنے فوری مفادات کے لیے انہی مذہبی جنونی قوتوں کو اپنی خارجہ پالیسی کے لیے استعمال کرتی رہی ہیں۔ مگر استعمال ہونے والی قوتیں اب ان کے استعمال کی نہیں رہیں اور وہ خود بھی اب ایک ٹشو پیپر کا کردار ادا کرنے کو تیار نہیں۔ کیونکہ جب وہ ''استعمال'' ہو رہے تھے ان کے اس استعمال ہونے میں بھی ان کے اپنے مذہبی انتہا پسندی کے نظریات کے پھیلاؤ کا فلسفہ پنہاں تھا۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی ان کے اپنے نظریات کے مطابق تھی۔ اس عمل میں وہ ایک قوت بن گئے۔ سرحد میں حکومت ہے، بلوچستان میں حکومت میں شریک ہیں، کراچی میں میئر ہے، لاہور اور دیگر علاقوں میں ممبران پارلیمنٹ ہیں۔ خفیہ مسلم گروپس ہیں۔ اربوں کی جائیداد ہے۔ لاکھوں طلبہ ان کے مذہبی اداروں میں پڑھتے ہیں۔ یہ سارے فیکٹرز ان کے لیے طاقت کا احساس کراتے ہیں چنانچہ جب پاکستان کی حکومت نے اپنی خارجہ پالیسی تبدیل کی تو انہوں نے تبدیل ہونے سے انکار کر دیا۔ اور لڑائی شروع ہو گئی۔

مذہبی جنونیت کا راستہ ایک نظریاتی لڑائی اور جنگ سے روکا جا سکتا ہے، سامراجی طریقہ کار سے نہیں۔ جبر ہمیشہ وقتی ہوتا ہے۔ جبر جمہوریت کی نفی ہے۔ جبر خوف اور دہشت ہے۔ یہ ایک ایسا طریقہ کار ہے جو حکمرانوں کو وقتی طور پر ہی مطمئن کر سکتا ہے۔

ہم قبائلی علاقوں میں موجودہ فوجی کارروائیوں کے خلاف ہیں، مگر ہم کسی بھی صورت اسامہ بن لادن اور ان کے دہشت گردی کے طریقہ کار کے ساتھ نہیں۔ جبر یا دہشت جارج بش کرے یا مشرف اور اسامہ بن لادن کرے یا کوئی اور مذہبی فرد، اس کی حمایت نہیں کی جا سکتی۔ نہ ہی ہم مشرف کے ساتھ الائنس بنا کر مذہبی جنونی قوتوں کے ''خاتمے'' کی جدوجہد میں شریک ہو سکتے ہیں۔

مذہبی جنونیت ایک ایسا نقطہ نظر ہے جس کے خاتمے کی کوشش ہی محنت کش طبقات کے مفاد میں ہے مگر ایسا صرف اور صرف اپنی تنظیموں، تحریکوں کو طبقاتی بنیادوں پر مضبوط کرتے ہوئے متحدہ کوششوں سے کیا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

عورتوں کی نمائندگی اور مذہبی وسیاسی جماعتوں کا ردعمل

سلمان عابد (مارچ2004ء)

اگرچہ پاکستان میں عورتوں کی نمائندگی کی بحث پچھلے چند برسوں میں نہ صرف آگے بڑھی ہے بلکہ اس بحث کے نتیجے میں فیصلہ ساز اداروں میں عورتوں کی نمائندگی بھی ممکن ہوئی ہے۔ بالخصوص مقامی حکومتوں کے نظام میں عورتوں کی 33 فیصد مخصوص نمائندگی اور اس کے نتیجے میں 36222 عورتوں کا مقامی سطح پر بطور نمائندہ منتخب ہونا اور پھر اس کے بعد قومی، صوبائی اور سینٹ کی سطح پر عورتوں کی تقریباً 17 فیصد نمائندگی، ملکی سطح پر ایک تبدیلی ہے۔

لیکن اس تبدیلی کے باوجود بدقسمتی سے ماضی کے مقامی حکومتوں کے انتخابات 2000/2001ء میں پاکستان کے بعض علاقوں بالخصوص صوبہ سرحد کے بعض اضلاع دیر، مردان، بونیز، کوہستان، بٹ گرام، کوہاٹ اور بنوں، پنجاب کے اضلاع بھکر، میانوالی، خانیوال اور لیہ، بلوچستان کے ڈیرہ بگتی، کیچ سندھ کے اضلاع جیکب آباد اور لاڑکانہ میں وہاں کی مقامی سیاسی ومذہبی جماعتوں نے نہ صرف عورتوں کی نمائندگی کو بزور طاقت روکا بلکہ ان کی شرکت کے خلاف باقاعدہ تحریری معاہدے کیے گئے اور ان کے خلاف سخت زبان میں باقاعدہ فتوے بازی کی گئی۔ ان فتووں کی بڑے پیمانے پر اخبارات کے ذریعے تشہیر کی گئی اور مقامی سطح پر انہیں تقسیم کیا گیا اور اس طرح عورتوں میں باقاعدہ خوف وہراس پھیلایا گیا۔ جس کے نتیجے میں بالخصوص صوبہ

سرحد کے اضلاع میں عورتوں کی مخصوص نشستوں پر عورتوں نے بطور امیدوار حصہ نہ لیا اور ان کی نشستیں خالی رہ گئیں۔

ان اضلاع میں عورتوں کی نمائندگی کو بزور طاقت روکنے میں وہاں کی مقامی برادریوں سیاسی و مذہبی گروپوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس صورتحال کے تناظر میں ملک میں چھ ہزار بائیس (6022) یونین کونسل کی کل 9794 خالی نشستوں میں سے خواتین کی 4861 نشستیں خالی رہ گئیں۔

اگر چہ ان نشستوں کے خالی رہ جانے کی کئی وجوہات تھیں لیکن ایک بڑی وجہ عورتوں کی نمائندگی کے بارے میں معاشرے میں موجود سیاسی اور مذہبی عناصر کے تعصبات بھی تھے جو عورتوں کی نمائندگی کے سرے سے ہی خلاف ہیں اور اس کے لیے باقاعدہ مخالفانہ مہم بھی چلا رہے ہیں۔ ان کے نزدیک عورتوں کی نمائندگی سے نہ صرف خاندانی نظام متاثر ہوگا بلکہ اس سے معاشرے میں بے ہودگی کا کلچر بھی نمایاں ہوگا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عورتوں کی نمائندگی کے ناقدین عورتوں کی نمائندگی کو مذہبی بنیادوں پر خلاف دین سمجھتے ہیں۔ جب مذہبی بنیاد پر ان کی دلیل کو نہ مانا جائے تو ان میں بعض ناقدین اسے اپنی سیاسی، سماجی، خاندانی روایات کے منافی قرار دینے کی دلیل پیش کرتے ہیں۔

یہ رویہ خالصتاً عورتوں کے بارے میں موجودہ تعصبات کو نمایاں کرتا ہے۔ ماضی کے مقامی حکومتوں کے انتخابات میں عورتوں کی نمائندگی میں رکاوٹیں کھڑی کرنے، فتوے جاری کرنے اور خوف و ہراس کی فضا ہموار کرنے کے عمل کو ملکی اور بین الاقوامی سطح دونوں پر خاصی تنقید کی گی۔ سنجیدہ حلقوں نے مذہبی اور سیاسی جماعتوں کے اس کردار کو عورتوں کی نمائندگی کے تناظر میں دوہرا معیار قرار دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جن مقامی سیاسی، مذہبی جماعتوں اور ان کے رہنماؤں نے عورتوں کی نمائندگی کے خلاف جو تحریری معاہدے کیے، ان پر بھی ان کے مرکزی راہنماؤں نے اپنے مقامی راہنماؤں کے خلاف کوئی اقدامات نہیں کیے۔ اسے مقامی مسئلہ قرار دے کر اس

اہم معاملے میں اپنی عدم دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔

ملک میں 28 مارچ 2004ء کو مقامی حکومتوں کے نظام میں یونین کونسل کی سطح پر خالی رہ جانے والی نشستوں پر انتخابات کروائے جارہے ہیں اور اس کے لیے 3 سے 8 مارچ تک کاغذات نامزدگی وصول کیے گئے ہیں تو اس بار عورتوں کی خالی نشستوں کے حوالے توقع کی جارہی تھی کہ اس مرتبہ عورتوں کی نمائندگی کے تناظر میں ماضی کی روایات کو نہیں دہرایا جائے گا اور وہ عناصر جنہوں نے ماضی میں عورتوں کی نمائندگی کو بزور طاقت روکا تھا وہ اپنے رویے پر نظر ثانی کریں گے۔ صوبہ سرحد میں چونکہ متحدہ مجلس عمل کی حکومت ہے اور وہاں کی مذہبی وسیاسی برادریوں اور گروپوں میں متحدہ مجلس عمل کا منصوبہ اثر ورسوخ ہے اور وہ حکومت کا حصہ بھی ہیں۔ اس وقت بھی عالمی اور ملکی سطح پر متحدہ مجلس عمل کے بارے میں میں لوگوں میں احساس پایا جاتا ہے کہ ان کی حکومت، عورتوں کی سیاسی، سماجی اور معاشی حیثیت کو بدلنے کے بارے میں نہ صرف تضادات کا شکار ہے بلکہ وہ مضبوط تعصبات بھی رکھتے ہیں۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ یہ عناصر ملک میں عورتوں کے بارے میں طالبان کا اسلام نافذ کرنا چاہتے ہیں۔

پچھلے دنوں ضمنی انتخابات کے لیے عورتوں کے کاغذات نامزدگی جمع کرانے کے دوران ایک بار پھر صوبہ سرحد میں پرانی تاریخ کو دہرایا گیا ہے مثلاً ضلع اپر دیر کی ورایئ (Warai) تحصیل کے ریٹرننگ آفیسر نے عورتوں کے کاغذات بطور امیدوار وصول کرنے سے انکار کیا اور مسلسل ٹال مٹول کا مظاہرہ کرتا رہا۔ اسی طرح اسی ضلع کی بیشتر سیاسی جماعتوں نے نئی ووٹرلسٹوں کو ماننے سے انکار کیا جس کے باعث عورتیں بطور امیدوار اپنے کاغذات جمع نہ کرواسکیں۔ ضلع بونیر کی یونین کونسل چنگلی (Chingley) میں وہاں مقامی ناظم اور مرد کونسلروں نے عورتوں کو انتخابات میں حصہ لینے سے عملاً روک دیا۔

مردان کے ضلعی ریٹرننگ آفیسر نے عورتوں کی مزدور کسان نشستوں پر زمین کی ملکیت کے کاغذات کے بغیر کاغذات نامزدگی وصول کرنے سے انکار کیا۔ حالانکہ ملک میں عورتوں کے

نام جائیداد کا کوئی تصور نہیں۔

ایک طرف جہاں عورتوں کو کاغذات نامزدگی کے دوران حکومتی عمل سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا وہاں ایک بار پھر مقامی سیاسی جماعتوں اور ان کے راہنماؤں جن میں پیپلز پارٹی، پارلیمنٹیرین کے اورنگ زیب، بہادر خان، پیپلز پارٹی شیر پاؤ کے خادم جان اور بخت بہارد، مسلم لیگ (ق) کے سردار عبدالرحیم تاجک ایڈووکیٹ، مسلم لیگ (ن) کے رشید ایڈووکیٹ، عوامی نیشنل پارٹی کے حسین شاہ اور جماعت اسلامی کے شجاع الملک افکاری، ایم این اے احمد غفور سمیت دیگر جماعتوں اور راہنماؤں نے 2 مارچ 2004ء کو ایک مشترکہ اجلاس میں متفقہ طور پر کہا کہ وہ عورتوں کی نمائندگی کو نہیں ہونے دیں گے۔ ماضی میں بھی اسی رویے کے باعث صوبہ سرحد کے اضلاع مردان میں 186، کوہاٹ 174، بٹ گرام 120، کوہستان 228، بنوں 126، اپر دیر 148، لوئر دیر 196، عورتوں کی نشستیں یونین کی سطح پر خالی رہ گئی تھیں اور اب ڈر ہے کہ ماضی کی اس روایت کو دوبارہ دہرا کہ ایک بار پھر عورتوں کی نمائندگی کو ناممکن بنایا جا رہا ہے۔ جس کے باعث بڑی تعداد میں عورتوں کی یہ نشستیں خالی رہ جائیں گی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ مذہبی جماعتیں ایک طرف ملک میں عورتوں کی نمائندگی کے خلاف ہیں اور دوسری طرف متحدہ مجلس عمل کی خواتین ملک کی چاروں صوبائی اسمبلیوں و سینٹ اور قومی اسمبلی اور مقامی حکومتوں میں عورتوں کی مخصوص نشستوں پر بطور نمائندہ موجود ہیں۔ مذہبی جماعتوں کا یہ تضاد قابل تنقید ہے اور جس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔

اسی طرح پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ جو اپنے آپ کو روشن خیال جماعتیں کہلواتی ہیں ان کے تضادات بھی عورتوں کی نمائندگی کے مسئلے پر نمایاں ہیں۔ اسی طرح ہمیں اس مسئلے پر سول سوسائٹی کے اداروں اور عام افراد کے رویوں کا بھی تجزیہ کرنا ہوگا کہ وہ ان مسائل پر کیوں خاموش ہیں۔ اگرچہ کچھ اداروں نے اس پر آواز اٹھائی ہے لیکن ان کی آواز میں سب کی آواز شامل نہیں ہے اور اس کمزور آواز ہی کی بناء پر اس طرح کے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ اس لیے جب تک

سول سوسائٹی سے وابستہ افراد ان پر اپنی موثر آواز نہیں اٹھائیں گے اور ان لوگوں کے خلاف مزاحمت نہیں کریں گے جو عورتوں کے بارے میں تعصّبات رکھتے ہیں تو بات آگے نہیں بڑھے گی۔

اس سارے تناظر میں الیکشن کمیشن کا کردار کافی اہم ہے۔ ماضی میں بھی الیکشن کمیشن اس طرح کے واقعات پر کوئی بڑا مؤثر کردار ادا نہ کر سکا اور اب بھی الیکشن کمیشن کی طرف سے اس مسئلے پر خاموشی ان قوتوں کو تقویت دیتی ہے جو بزور طاقت اور عورتوں کی نمائندگی کو روکنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ الیکشن کمیشن ایسی یونین کونسلوں کے خلاف قانونی کارروائی کرے جہاں عورتوں کو انتخابات میں حصہ لینے سے روکا جا رہا ہے اور اس کے تحت ان کونسلوں کو اس وقت تک معطل رکھا جائے، جب تک وہاں عورتوں کی نشستیں مکمل نہیں کی جاتیں۔ اس طرح وفاقی حکومت اور بالخصوص جنرل پرویز مشرف کو اس طرح کے معاملات پر فوری ایکشن لینا چاہیے اور ان واقعات پر صوبہ سرحد میں متحدہ مجلس عمل کی حکومت کی جواب دہی ہونی چاہیے کہ ان کی حکومت کی چھتری کے نیچے' یہ کیا ہو رہا ہے اور کیا یہ سب کچھ صوبہ سرحد کی حکومت کی سرپرستی میں ہو رہا ہے اور اگر نہیں تو پھر صوبہ سرحد کی حکومت نے اس کے لیے کیا اقدامات کیے ہیں؟

ہمارے بدقسمتی یہ ہے کہ مذہب کے نام اور فرسودہ روایات اور عورتوں کے بارے میں موجودہ معاشرتی تعصّبات کو سامنے رکھ کر عورتوں کی نمائندگی کے خلاف مہم جاری ہے۔

☆☆☆

The Wana Miscalculations

واناآپریشن!

غلط اندازے، بھاری نقصان

انفرادی دہشت گردی کو ریاستی دہشت گردی سے ختم نہیں کیا جاسکتا

فاروق طارق (اپریل 2004ء)

وانا میں 12 روز تک ملٹری آپریشن میں دس ہزار سے زائد فوجی و نیم فوجی دستے بھاری نقصان کے بعد بھی ''کامیابی'' کا دعوی کرتے نظر آرہے ہیں۔ ''کامیاب آپریشن'' کے دوران 46 فوجی جاں بحق ہوئے جبکہ ہلاک ہونے والے ''دہشت گردوں'' کی تعداد 63 کے قریب تھی۔ وفاقی وزیر داخلہ فیصل حیات کے مطابق کل 177 افراد مارے گئے۔ جرنیل شوکت سلطان نے 30 مارچ کو ایک پریس بریفنگ میں کہا کہ 167 افراد گرفتار کئے گئے ہیں۔ جن میں 73 غیر ملکی اور 94 مقامی باشندے ہیں۔ کامیابی کا دعوی کرتے ہوئے کہا گیا کہ صرف ان قبائلیوں کے گھر مسمار کئے گئے ہیں جو دہشت گردوں کو پناہ دیئے ہوئے تھے لیکن ہوسکتا ہے کہ دوسرے مکان بھی زد میں آگئے ہوں۔ انہوں نے کہا کہ کاروائی سے بنیادی مقاصد حاصل کر لئے گئے ہیں۔ خود فوجی ترجمان شوکت سلطان کے مطابق ''یہ ممکن ہے کہ بعض بے گناہ افراد اور عمارتیں بھی اس آپریشن کی زد میں آگئی ہوں اور ایسا تو ہوتا ہی ہے''۔ 167 افراد کو گرفتار کرنے کا دعویٰ بھی کیا گیا ہے ان میں چیچن، ازبک اور قبائلی علاقوں سے تعلق رکھنے والے ''القاعدہ ممبران'' شامل بتائے جارہے ہیں۔

آپریشن کے دوران زمینی جنگ کے علاوہ فضائی مدد بھی لی گئی اور بعض مقامات پر بھاری بمباری کی گئی۔ یہ آپریشن خاص طور پر اس وقت شروع کیا گیا جبکہ امریکی وزیر خارجہ کولن پاول پاکستان کے دورے پر آئے۔ جرنیل شوکت سلطان نے اس بارے میں کہا کہ یہ آپریشن اس سے بہت پہلے پلان کیا گیا تھا۔

آپریشن کے دوران جنرل مشرف نے سی سی این کو ایک انٹرویو میں یہ کہہ کر سنسنی پھیلا دی کہ القاعدہ کے ایک بڑے ٹارگٹ کو ہم پکڑنے کے قریب ہیں۔ عالمی سرمایہ دارانہ میڈیا نے اس ٹارگٹ کو مصری فزیشن ایمن الزواہری بتایا۔ ایمن الزواہری القاعدہ نیٹ ورک میں اسامہ بن لادن کے بعد اہم ترین بتائے جاتے ہیں اور امریکہ کی عالمی دہشت گردوں کی لسٹ میں ٹاپ پر ہیں۔ 12 روزہ آپریشن کے بعد ایمن الزواہری کو پکڑنے کا دعوی تو سچ نہ ہوسکا، البتہ القاعدہ کے انٹیلی جنس چیف عبداللہ کو مارنے کا دعوی کر دیا گیا۔ پشاور میں موجود پاکستانی تجربہ کار صحافیوں کے مطابق انہوں نے کبھی بھی اس سے قبل عبداللہ کا نام تک نہ سنا تھا۔ یہ دعوی بھی کیا گیا کہ ایک چیچن راہنما یالدشیف (Yuldeshev) زخمی حالت میں فرار ہوگیا۔

دانا آپریشن اپنے تمام اعتبار سے ایک ناکام آپریشن ثابت ہوا ہے اس میں غلط اندازے لگائے گئے۔ غلط اعداد وشمار پیش کئے گئے۔ سرکردہ راہنماؤں کو مارنے یا پکڑنے میں ناکامی ہوئی۔ فوجی ہلاکتوں کی تعداد بہت زیادہ ہوئی اور امریکی سامراج کو خوش کرنے کی یہ تدبیر موجودہ فوجی حکمرانوں کو بہت مہنگی پڑی ہے۔ 22 مارچ کو صرف ایک جوابی حملہ میں جنوبی وزیرستان کے اندر 20 فوجی ہلاک اور 24 زخمی ہوئے۔ کئی دوسرے حملوں میں یرغمالیوں کی تعداد بھی درجنوں تک پہنچی جن میں بعض کو بے دردی سے ہلاک کر دیا گیا اور بقیہ کو فوج کے واناواپسی سے مشروط کرتے ہوئے رہا کر دیا گیا۔

ڈیڑھ سو سال بعد قبائلی علاقوں میں فوج کشی کے نتائج جنرل مشرف کی امیدوں کے مطابق نہ نکلے ہیں اور اب اسے ایسے کسی آپریشن کے لئے زیادہ بہتر حکمت عملی اور کئی گنا زیادہ بہتر

انٹیلی جنس رپورٹیں مرتب کرنا ہوں گی۔ 12 روزہ فوجی آپریشن کا موازنہ عراق پر امریکی فوج پر مسلسل حملوں سے کیا جاسکتا ہے جس میں امریکی افواج کے سپاہی مسلسل مارے جارہے ہیں۔ 31 مارچ کو فلوجہ میں 4 امریکی سپاہیوں کو زندہ جلا کر ان کی لاشوں کو جس طرح ھرات پل پر لٹکا دیا گیا اس سے عراقیوں میں امریکیوں کے خلاف پائی جانے والی شدید نفرت کا اظہار ہوتا ہے۔

وانا آپریشن اور اپوزیشن

جنرل مشرف کو اپنی موجودہ سرکاری وغیر سرکاری اپوزیشن کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جنہوں نے ایک یا دوسرے بہانے وانا کے ایشو پر مہم صرف الفاظ کی حد تک چلائی اور اس طرح درحقیقت جنرل مشرف کے اس آپریشن کی مکمل حمایت کی۔

ایم ایم اے

صوبہ سرحد میں ایم ایم اے کی حکومت ہے۔ بھاری اکثریت ہے اور صوبائی سطح پر انہیں کوئی بڑی اپوزیشن کا سامنا بھی نہیں۔ اس حکومت نے وانا آپریشن کے بارے میں صرف سطحی بیان بازی کی جبکہ عملی طور پر حکومت کے آپریشن کا ساتھ دیا۔ ایم ایم اے کے مرکزی راہنما مولانا فضل الرحمان، وانا آپریشن کے دوران انگلینڈ روانہ ہوگئے اور وہاں جا کر مذمتی بیان دے رہے ہیں۔ جماعت اسلامی کے قاضی حسین احمد جماعت اسلامی کے اندرونی انتخابات میں امیر منتخب ہو رہے تھے۔ انہوں نے بھی وانا آپریشن کی سخت الفاظ میں مذمت کی مگر سخت ایکشن لینے میں مکمل نا کام رہے۔ وفاقی وزیر داخلہ فیصل حیات نے قومی اسمبلی میں کہا کہ وانا آپریشن کے دوران ایم ایم اے قیادت کو اعتماد میں لیا گیا۔ اب وہ صرف سیاسی سکور بازی کر رہے ہیں۔ ایم ایم اے کے لیے وانا کوئی ایشو نہ بن سکا جس کو بنیاد بنا کر مرکزی حکومت سے کسی تضاد میں جاسکتی۔ وانا ایک خالی بڑھک بازی کا مرکز بنا رہا۔ ایم ایم اے کا صوبائی وقومی سطح پر بزنس معمول کے مطابق چلتا رہا۔ ان کی روٹین میں کوئی فرق نہ آیا۔ فرق آتا بھی کیسے۔ ابھی تو انہوں نے ایل ایف او کے ایشو پر جنرل مشرف کی 17 ویں ترمیم کو دو تہائی اکثریت سے منظور کرایا تھا۔ وہ اپنے اس طرز عمل سے فوجی

حکمرانوں اندرونی مفاہمت کے سلسلے کو جاری رکھنے میں اپنی عافیت سمجھ رہے ہیں۔

اے آر ڈی

وانا کے ایشو پر اے آر ڈی نے 31 مارچ کو اپنے مجوزہ وانا مارچ کو منسوخ کر دیا۔ پیپلز پارٹی نے تو واضح طور پر کہہ دیا کہ وہ ''دہشت گردی'' کے خلاف ہیں اور حکومت کے دہشت گردوں کے خلاف اقدامات کی حمایت کرتے ہیں۔ صرف ناجائز قتل وغارت نہیں ہونی چاہیے۔ پیپلز پارٹی نے اپنے اسی موقف کو دوبارہ دھرایا ہے کہ جو ستمبر 2001ء کے بعد انہوں نے اپنایا تھا۔ پیپلز پارٹی درحقیقت امریکی سامراج کی عالمی سطح پر چلنے والی ''دہشت گردی کے خلاف مہم'' کی بھرپور حامی ہے اور اس طریقہ کار سے وہ امریکی سامراج کی نظروں میں قربت چاہتی ہے۔

مسلم لیگ (ن) نے وانا مارچ کرنے کی بجائے اس کو منسوخ کرنے کی ذمہ داری پیپلز پارٹی پر ڈالتے ہوئے اپنی جان چھڑانے کی کوشش کی ہے۔ 30/31 مارچ کو دونوں پارٹیوں کے مخالفانہ بیانات سرمایہ درانہ اخبارات میں شائع ہوئے۔ ایک دوسرے پر الزام تراشی کی گئی۔ یہ صرف تحریک نہ چلانے کے لیے عوام کو یہ بتانا مقصود تھا کہ اندرونی تضادات ہیں۔ مسلم لیگ (ن) ابھی تک کھل کر اپنی خارجہ پالیسی واضح نہ کر سکی ہے۔ وہ ایک طرف اپنے رجعتی رائیٹ ونگ کردار کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں اور دوسری جانب امریکی سامراج سے بھی تعلقات خوشگوار رکھنا چاہتے ہیں۔ اپنے رائیٹ ونگ کردار کے اظہار کے لئے ہی انہوں نے اکتوبر 2002ء میں ایم ایم اے کے بعض ارکان اسمبلی کو کامیاب کرانے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا اور اسامہ بن لادن کے ''جہاد'' کی درپردہ حمایت کی تھی۔ ایم ایم اے کی جانب سے ایل ایف او کے ایشو پر فوجی حکمرانوں کی کھل کر حمایت کی مسلم لیگ (ن) نے مذمت کی۔ مگر ایم ایم اے کو فروغ دینے میں مسلم لیگ (ن) کا ایک بنیادی کردار ہے۔ یہ صرف ایک سیاسی غلطی نہ تھی بلکہ مسلم لیگ (ن) کی مشرف دشمنی میں اپنے تمام ہتھکنڈوں کو استعمال کرنے کی ترغیب تھی۔

وانا کے ایشو پر اے آر ڈی میں جو دراڑیں آئی ہیں اس سے اے آر ڈی کا حال بھی ایم ایم اے

جیسا ہو گیا ہے۔ ایم ایم اے میں بھی کئی جماعتیں کھل کر ایم ایم اے کی پالیسوں کی مخالفت میں بیان بازی بھی کرتی ہیں اور ایم ایم اے کا حصہ بھی ہیں۔ یہ پرلے درجے کی موقع پرستی ہے اور منافقانہ پن ہے۔

وانا آپریشن کیوں ہوا؟

وانا آپریشن امریکی سامراج کے دباؤ تلے شروع ہوا۔ اس کا بنیادی مقصد امریکی سامراج کی خارجہ پالیسی کے عین مطابق ''دہشت گردوں'' کا قلع قمع تھا۔ یہ آپریشن صدر بش کی اس سوچ کے عین مطابق تھا کہ گفت وشنید سے بہتر ہے کہ مخالفین کو جبر کے ذریعے خاموش کر دینا چاہیئے۔ یہ سوچ بھی عراق پر حملے کا باعث تھا اور اس کی بنیاد پر فلسطین میں اسرائیلی وزیر اعظم شیرون کی دہشت گردی پیدا ہوئی۔ فلسطین میں شیخ یاسین کو ہلاک کرنا بھی اس سوچ کا تسلسل تھا۔ اس لحاظ سے جنرل پرویز مشرف اب بش، بلیئر اور شیرون کے ہم پلّہ ہو گئے ہیں۔ یہ تینوں ایک ہی فلسفہ پر کام کر رہے ہیں۔ یہ حملہ القاعدہ کے چند ''دہشت گردوں'' کو ختم کرنے کے لئے نہ تھا بلکہ تمام قبائلی علاقوں کے علاوہ پاکستان میں موجودہ اپوزیشن کے لئے بھی تھا۔ یہ تمام قبائلی علاقوں کے علاوہ پاکستان میں موجودہ اپوزیشن کے لئے ایک سبق تھا کہ مخالفین کے خاتمہ کے لئے کسی بھی سطح تک جایا جا سکتا تھا۔ یہ ایک وارننگ تھی مخالفین کے لئے اور فوجی رعب ودبدبہ کا ایک اظہار تھا۔

دہشت گردی بطور طریقہ کار

جس طرح جنرل مشرف جبر کے ذریعے اپوزیشن ختم نہیں کر سکتا اس طرح القاعدہ بھی مخالفین کو بم دھماکوں، خودکش دھماکوں یا دہشت گردی کے کسی اور واقعہ سے ختم نہیں کر سکتی، نہ ہی انہیں خاموش کرا سکتی ہے۔

ستمبر 2001ء کے کامیاب واقعہ سے بڑھ کر اور کیا کیا جا سکتا تھا؟ بالی انڈونیشیا میں بم دھماکوں میں 200 افراد ہلاک ہو گئے۔ میڈرڈ میں ابھی حال ہی میں ٹرین بم دھماکوں سے 191 مزید افراد ہلاک ہوئے۔ ان تمام واقعات سے بم دھماکوں میں خود کو اڑانے والوں یا ان کا اہتمام کرنے والوں کو تو ''اطمینان'' ہوا ہوگا کہ ہم نے بدلہ لے لیا ہے۔ مگر جس طرح جنرل مشرف کے موجودہ فوجی آپریشن میں

عام لوگ مارے گئے، اسی طرح ان واقعات میں بھی وہ لوگ مارے گئے، جن کا بش بلیئر یا شیرون کی پالیسوں سے کوئی تعلق بھی نہ ہوگا۔ یا یہ ہوسکتا ہے ان میں اکثر ان کے خلاف ہوں۔

دہشت گردی کا کامیاب ترین واقعہ بھی وقتی طور طور پر حکمرانوں میں ہیجان، پریشانی، تذبذب، ڈر، کنفیوژن اور خوف کے احساسات جنم دے سکتا ہے، طویل عرصہ کے لئے نہیں۔ ایسے واقعات عمومی طور پر بدلے کے جذبات کو مضبوط کرتے ہیں۔ یہ بدلے کی طرز کی جنگ ہے جو بش اور بلیئر لڑ رہے ہیں اور جس کے ساتھ ان کے دیگر معاشی وسیاسی مفادات جڑے ہوئے ہیں۔

دہشت گردی کا ہر واقعہ مخالف کو بہانہ مہیا کرتا ہے اور وہ مخالف پر حملہ کر دیتا ہے۔ اس سے حکمران طبقات کو وہ بہانہ ملتا ہے جس کی بنیاد پر ایسی قانون سازی کرائی جاتی ہے جس سے مجموعی طور پر شہری آزادیاں سلب ہو جاتی ہیں۔ دہشت گردی کا طریقہ کار محنت کش طبقات کا نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے گروپوں کا ہے، جن کا عوامی طاقت پر کوئی یقین نہیں۔ جو عوامی طاقت سطح پر موبلائزیشن کی بجائے اور عوام کی بجائے خود ہیرو بن کر سب کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے واقعات عوامی طاقت، جلسے جلوس، مظاہروں، ہڑتالوں پر عدم اعتماد ہیں۔

دہشت گرد کون ہیں؟

آج دنیا میں انفرادی اور ریاستی دونوں سطح پر بھرپور جاری ہے۔ ریاستی سطح پر دہشت گردی امریکی صدر بش کے اقتدار سنبھالنے کے بعد مزید تیز ہوگئی ہے۔ امریکی سامراج ریاستی دہشت گردی کو اپنے مالی وسیاسی مفادات کے تحفظ کا بہترین ذریعہ سمجھتا ہے۔ اسی کی نقالی میں دیگر سرمایہ دار ریاستیں بھی دہشت گردی کا راستہ اختیار کر رہی ہیں۔

دہشت گردی جہاں انفرادی اور ریاستی سطح پر ہے وہاں ہی اس کی وسعت (extension) زندگی کے ہر شعبہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ معاشی دہشت گردی ہے کہ اربوں انسان بھوکے مر رہے ہیں اور چند سو افراد زندگی کی ہر عیاشیوں کا مزا چکھ رہے ہیں۔ یہ ثقافتی دہشت گردی ہے کہ روپے پیسے اور میڈیا کے زور پر صدیوں پرانی ثقافتوں کو نظر انداز

کر دیا جائے۔ ہر وہ ایکٹ دہشت گردی کے زمرے میں آتا ہے جو مخالف یا مختلف نظریات کو جبر سے دبانے میں استعمال ہوتا ہے۔

سرمایہ داری نظام بنیادی طور پر ایک دہشت گردی کو پروان چڑھانے والا نظام ہے جس میں ایک چھوٹی اقلیت بڑی اکثریت کا طبقاتی استحصال کرتی ہے۔ اس سے عوام میں تفریق پیدا ہوتی ہے۔ انفرادی دہشت گردی کے عمل سے تو چند، چند سو یا چند ہزار افراد ہلاک ہوتے ہوں گے، مگر سرمایہ دار نظام کی دہشت گردی کی وجہ سے روزانہ لاکھوں افراد ایسی بیماریوں کا شکار ہو کر فوت ہو جاتے ہیں، جن کا علاج ممکن ہے۔ مگر علاج کے لئے وسائل ان کے پاس نہیں اور جن کے پاس وسائل ہیں، انہیں حل نہیں کرتے۔

مذہبی دہشت گردی کیا ایک حل ہے؟

امریکی سامراج اور اس کے حواریوں کی معاشی و سیاسی پالیسوں کے نتیجہ میں خاص طور پر مسلمانوں میں ایک بڑی نفرت نے جنم لیا ہے۔ اور بعض مسلمان گروپوں نے اس کا جواب دینے کے لئے "جہاد" کے نام پر وہی راستہ اختیار کیا ہے جو امریکی سامراج کا ہے۔ یعنی قتل کا بدلہ قتل، دہشت گردی کا جواب دہشت گردی۔ نتیجتاً ایسے واقعات رونما ہوئے جس نے حالیہ تاریخ کو ہلا کر رکھ دیا۔ ایسے واقعات سے تاریخ کو بدلا نہیں جا سکتا۔ سمجھنے کی یہ ضرورت ہے کہ امریکی سامراج کا ایک حصہ اگرچہ مذہبی بنیادوں پر بھی سوچ رہا ہے مگر اس کا زیادہ تر حصہ معاشی بنیادوں پر دوسری اور تیسری دنیا کا استحصال جاری رکھ رہا ہے۔ اس کا جواب مذہبی بنیادوں پر نہیں دیا جا سکتا بلکہ طبقاتی بنیادں پر تمام مذاہب کے استحصال زدہ افراد کے اکٹھ اور اس کے بعد اس کے عوامی اظہار سے دیا جا سکتا ہے۔

مذہبی دہشت گردی کوئی حل نہیں اور نہ ہی اس سے امریکی سامراج کو مزا چکھایا جا سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ امریکی سامراج کو ختم کر دیا جائے مگر یہ خاتمہ کسی بھی صورت مذہبی بنیادوں پر نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ایک مذہبی جنگ سے امریکہ یا دیگر ممالک کو بدلا بنایا جا سکتا ہے۔ ان کا خاتمہ ایک عوامی تحریک اور بڑی سرکشی ہڑتالوں سے ہی کیا جا سکتا ہے اور ایسا بلا تفریق

مذہب افراد کے اکٹھ سے ہی ممکن ہے۔

وانا آپریشن اور مستقبل

پاکستان کی فوجی حکومت کو وانا میں ایک سبق ملا ہے۔ وہ سبق یہ ہے کہ بہت بڑے نقصان کے بغیر قبائلی علاقوں سے القاعدہ کے ممبران کو نکالا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا اب کافی حد تک سیاسی تدبیروں سے کام لیا جا رہا ہے، جرگے بلائے جا رہے ہیں۔ یکم اپریل 2004ء کو گورنر سرحد افتخار حسین شاہ نے پچاس قبائلی راہنماؤں سے ملاقات کے بعد ایک بیان میں کہا ''غیر ملکی باشندوں کو ہم قیام کی مشروط پیش کش دیتے ہیں، وہ ہتھیار ڈال دیں اور متعلقہ قبیلہ ضمانت دے۔ اگر وہ لڑنا چاہتے ہیں تو وہ اپنے ملکوں میں چلے جائیں''۔ اس بیان سے حکومت کی پسپائی کا اظہار ہوتا ہے اور وقتی پسپائی کے بعد مزید فوجی آپریشن کی بہتر تیاری کے لئے جو وقت درکار ہے اس کی تیاری کی جا رہی ہے۔ فوجی حکومت فوجی آپریشن کرتی رہے گی مگر یہ سوچ کر اس سے القاعدہ ممبران کو نکالا تو نہ جا سکے گا لیکن عالمی سطح پر ''کچھ کرنے'' کا تاثر جاری رہے گا۔ شائد اب فوجی آپریشنوں میں ان غلطیوں یعنی یہ غلط اندازہ نہیں ہوگا کہ راستہ صاف ہے اور مزاحمت نہ ہوگی لہٰذا آگے بڑھو، سے احتراز کیا جائے گا۔

پاکستان میں مذہبی دہشت گردی کی بنیادی وجوہات کو ختم کئے بغیر اس کا خاتمہ ممکن نہیں۔ موجودہ حکومت مذہبی دہشت گردی ختم کرنے کا تاثر دے رہی ہے لیکن اس کی بنیادوں کو مزید پکا کر رہی ہے۔ مذہبی تعلیم کو سرکاری سرپرستی جاری ہے۔ مذہبی مدارس کو مزید رقم دی جا رہی ہے۔ اصلاحات کے نام پر تدریسی نصاب میں مذہبی غلبہ جاری ہے۔ مذہبی جماعتوں کی مدد سے موجودہ حکومت ''قانونی'' ہوئی ہے، مذہبی جماعتوں سے مل کر بلوچستان میں حکومت جاری ہے۔ اور صوبہ سرحد میں مذہبی جماعتوں کو کھلا ہاتھ دیا جا رہا ہے۔ ان تمام کے باوجود کس طرح مذہبی بنیادوں پر دہشت گردی ختم کی جا سکتی ہے۔

مذہبی دہشت گردی صرف اور صرف محنت کشوں کی طبقاتی بنیادوں پر ایک بڑی عوامی تحریک ہی بالآخر ختم کرنے میں مدد دے سکتی ہے۔

☆☆☆

بھارتی انتخابات

واجپائی کی امن پسندی؟.....نہیں.....انتخابات کے لیے موقع پرستی

فاروق طارق (انتخابات کے نتائج سے قبل) (اپریل2004ء)

پاکستانی میڈیا بھارتی وزیراعظم اٹل واجپائی کو ایک معتبر، معتدل اور ٹھنڈے مزاج کا راہنما کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ہندو شاونسٹ راہنما ہیں۔ ہندوستان کے پچھلے تین عام انتخابات میں کبھی اقلیت اور کبھی اکثریت کے ساتھ وہ حکومت بنا رہے ہیں۔ اپریل، مئی 2004ء میں وقت سے پہلے ہونے والے عام انتخابات میں ایک بار پھر میدان میں ہیں۔ انہوں نے دیگر علاقائی پارٹیوں سے مل کر نیشنل ڈیموکریٹک الائنس (NDA) بنایا ہے۔ ان انتخابات میں واجپائی ماضی کے دعویٰ جات کے برعکس جن ایشوز پر انتخابات میں حصہ لے رہے ہیں۔ ان میں ہمسایوں سے بہتر تعلقات اور ایک ''feel good'' فیکٹرز شامل ہیں۔ اس کی حکومت ماضی میں ایک کروڑ نوکریاں ہر سال پیدا کرنے کے دعویٰ جات کرتی رہی ہے۔ مگر اس کے لگ بھگ نوکریاں بھی نہ نکل سکیں۔

واجپائی پہلی دفعہ صرف 13 دنوں کے لئے وزیراعظم رہے۔ دوسری ٹرم میں تیرہ ماہ اور اب تیسری ٹرم میں ترپّن ماہ سے اقتدار میں ہے۔ بھارتیا جنتا پارٹی اس عرصہ میں دوسری سرمایہ دار نہ علاقائی سیاسی پارٹیوں سے مل کر اپنے الائنس کو چلاتی رہی۔ کولیشن سیاست اس کے

اقتدار کی بنیاد رہی۔ اپریل مئی 2004ء کے بھارتی انتخابات میں سونیا گاندھی کی کانگریس بھی اس حکمت عملی کو کاپی کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ پچھلے عرصہ میں بی جے پی کے الائنس میں شامل چھ جماعتیں اس کی این ڈی اے (NDA) سے علیحدگی اختیار کر چکی ہیں۔ ان میں جموں و کشمیر کی نیشنل کانفرنس، اتر پردیش میں اجیت سنگھ کی راشٹریہ لوک دل، بہار میں رام دلاس پسوان کی لوک جن شکتی پارٹی اور تامل ناڈو کی ڈی ایم کے، ایم ڈی ایم کے اور پی ایم کے شامل ہیں۔ بی جے پی نے انتخابات جیتنے کے لئے ''مشن 2004ء'' کا نعرہ لگا کر عوام میں یہ تاثر پھیلانے کی کوشش کی ہے کہ ''سب اچھا ہے، اچھا محسوس کرو، اکنامی بہتر ہے، ہمسایوں سے تعلقات بہتر ہو رہے ہیں اور بھارت ترقی کے زینہ پر گامزن ہے''۔ Feel Good کا نعرہ سامراجی گلوبلائزیشن کا فائدہ چکھنے والوں کا ہے، جنہوں نے لوٹ مار کرنے کا لائسنس لے رکھا ہے، ملک کی پوری اکنامی ملٹی نیشنل کمپنیوں اور اجارہ دار کارپوریٹ ہاوسز کی لوٹ مار اور استحصال کے لئے کھول دی گئی ہے۔ بھارت اب خود کفالیت کے نام نہاد نعرے سے کھل کر باہر آ گیا ہے۔ ماضی میں بھارتی حکمران طبقات خود کفالیت کے نعرہ کو اپنا اعزاز سمجھتے تھے۔ مگر بھارتی عوام کے لئے جو کچھ دیا گیا ہے وہ ہے کہ کوئی نوکری نہیں، کوئی کھانا نہیں! بس اچھا محسوس کرو۔ واجپائی نے قبل از انتخابات کا اعلان کر کے اپنے فاشسٹ ایجنڈا کو ''اچھا محسوس کرو'' کے پردے میں چھپانے کی کوشش کی ہے۔

پاکستان سے اچھے تعلقات اور انتخابات

اسلام آباد میں جنوری 2004ء میں سارک سمٹ میں خوش نما 10 نکاتی سوشل چارٹر، ریجنل ٹریڈ میں اضافہ، پاک بھارت مذاکرات کا دوبارہ آغاز، دونوں ملکوں کا کھل کر مختلف وفود کو ویزے دینا اور اب بھارتی کرکٹ ٹیم کا 14 سالوں بعد پاکستان کا ایک بھرپور دورہ، واجپائی حکومت کی جانب سے اس تاثر کو دور کرنے کی کوشش ہے جس میں اسے بجا طور پر ایک متعصب ہندو جماعت کی حکومت کے طور پر سمجھا جاتا ہے۔ سارک ممالک کے تمام حکمران طبقات کو جس نمبر

ون دشمن سے لڑنا چاہئے وہ ہے امریکی سامراج اور سامراجی گلوبلائزیشن کے عمل تیز ہونا! مگر یہ تمام حکمران طبقات امریکی سامراج کو خوش کرنے کیلئے اپنے ہی عوام سے نبرد آزما ہیں۔ انہیں بھوک، غربت، بے روزگاری اور مزید بیماریوں میں دھکیلنے والی پالیسیوں پر گامزن ہیں۔ اسلام آباد سارک کانفرنس میں واجپائی اور جنرل مشرف کی علیحدہ میٹنگ بھی ہوئی اور اگر آپ یاد کریں کہ پچھلی سارک کانفرنس جو کھٹمنڈو میں ہوئی تھی اس میں جب جنرل مشرف نے آگے بڑھ کر واجپائی سے ہاتھ ملایا تو واجپائی کے تاثرات اس کا برا منانے کے تھے۔ مگر ماضی کے برعکس اسلام آباد سارک کانفرنس میں کشمیر سمیت تمام متنازعہ ایشوز پر سیاسی حل نکالنے پر اتفاق کیا گیا۔

پاکستان سے اچھے تعلقات کی واجپائی کوششوں کو صرف ایک ہی لفظ سے سمجھا جا سکتا ہے وہ ہے، منافقت! واجپائی انتہائی منافقت سے ہندوستان کے اندر وہ پالیسیاں لاگو کر رہا ہے جن سے مینارٹیز کے حقوق سلب ہوں، حقیقی تاریخ مسخ ہو جائے، ہندو مت غالب ہو، ان فاشسٹ نظریات کی موجودگی میں پاکستان سے دوستانہ تعلقات کے واجپائی دعویٰ جات صرف اور صرف منافقت ہی ہے اور وہ بھی انتہائی وقتی صرف انتخابات جیتنے کے لئے! شاید امن کا نوبل ایوارڈ لینے کی تمنا بھی اسے پاکستان سے تعلقات ''بہتر'' کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ واجپائی نے جنوری 2004ء میں جو منی بجٹ پیش کیا اس میں کافی پاپولسٹ نعرے تھے۔ مگر ڈیفنس اخراجات میں کمی کا کوئی اعلان نہیں۔ پاکستان اور بھارت کے حکمران اپنے دفاعی اخراجات میں حقیقی کمی کے بغیر اگر دوستی کا نعرہ لگاتے ہیں تو یہ دونوں کی منافقت اور موقع پرستی ہی ہو سکتی ہے۔

واجپائی کی پارٹی ان انتخابات میں ''امن کی فصل'' اسی طرح اگا رہی ہے جس طرح کہ وہ پچھلے انتخابات سے قبل ''کارگل جنگ کی فصل'' کاٹ رہی تھی۔ کانگریس اور بھارتیا جنتا پارٹی دونوں ہی ڈیفنس بجٹ کو ایک مقدس گائے سمجھتی ہیں، جس کو چھیڑنا ان کے بس کی بات نہیں۔ بھارت کا ڈیفنس بجٹ 1998 میں 9387 ملین ڈالر تھا یعنی 9 ارب ڈالر جو 2002ء میں بڑھ کر 12882 ملین ڈالر یعنی تقریباً 13 ارب ڈالر کے قریب ہو گیا۔

خاکی نیکر والوں کے کارنامے

سنگھ پریوار اور شیوسینا کے ثقافتی شہنشاہوں نے یہ ذمہ داری لے لی ہے کہ کس طرح کی ثقافت کی لوگوں کو اجازت دی جائے، عورتیں کس طرح کا لباس پہنیں اور طلبہ کیسی کتابیں پڑھیں؟۔ان کی تاریخ کی کتابوں میں اسلام اور سکھ مت ہندوستان کے بڑے مذاہب کے بطور ختم ہو چکے ہیں۔ واجپائی اور ایڈوانی کی ''سودیشی'' حکومت تیل کے علاوہ جنگی اہمیت کے شعبوں میں سو فیصد غیر ملکی سرمایہ کاری کی طالب ہے۔ خاکی نیکر والوں کا اقتدار میں آنے سے قبل سب سے بڑا کارنامہ 500 سال پرانی بابری مسجد کو شہید کرنا تھا۔ ہندوستانی زارعت کو ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے حوالے کرنے کی پالیسی کو نئی زرعی پالیسی کا نام دیا جارہا ہے۔عالمی سرمایہ ہندوستان کو لوٹ رہا ہے اور یہ اس کی چوکیداری کر رہے ہیں۔آر ایس ایس نے اپنے ابتدائی سالوں میں پولیس مخبروں اور برطانوی حکمرانوں کے پیدا کردہ فرقہ وارانہ جراثیم پھیلانے والوں کے طور پر امتیاز حاصل کیا تھا۔آج کل امریکی سامراج کے سامنے گھٹنے ٹیکنے میں کوئی ثانی نہیں رکھتے۔ زنا بالجبر کو ہندومت کا لازمی جزو قرار دینے والے سوارکار (Savarkar) کو قومی ہیرو قرار دینے کی کوششوں میں واجپائی حکومت نے اس کا ایک پورٹریٹ پارلیمنٹ کے سنٹرل ہال میں لٹکا دیا۔

ہندو جنونیوں نے تاریخ کا کباڑہ کر دیا

واجپائی کی بھارتیا جنتا پارٹی کی سب سے بڑی سپورٹر جماعت آر ایس ایس ہندوستانی تاریخ کا کباڑہ کر رہی ہے۔نصاب میں تبدیلیاں لائی جارہی ہیں۔آر ایس ایس کے سکولوں میں پڑھایا جارہا ہے کہ چین میں ثقافتی شمع ہندوستانیوں نے جلائی۔ ہندوستانیوں نے امریکہ کو دریافت کیا تھا۔گائے کے گوبر سے لپے گھر ایٹم کی تابکاری سہہ سکتے ہیں۔ 1528ء سے 1914ء تک رام مندر کی آزادی کے لئے ساڑھے تین لاکھ رام بھگتوں نے جان دی۔گائے کی جان انسان کی جان سے زیادہ بیش قیمت ہے۔ ویدوں کے مطابق گائے کو زخمی کرنے یا مارنے کی سزا جیسا بھی معاملہ ہو سلطنت سے خارج کرنا یا سزائے موت ہے وغیرہ وغیرہ۔

واجپائی جو نہ کر سکا

واجپائی نے اپنی تینوں دورِ حکومت کے دوران جو نہیں کیا وہ عوام کی بگڑتی حالت تبدیل کرنے کا کام۔ بھارت کے عوام کی ایک بڑی اکثریت اب بھی فاقہ کشی کا شکار ہے۔

زراعت : واجپائی کی زراعت پالیسی اجارہ دار کمپنیوں کی لوٹ مار کو مزید بہتر بنانے پر مشتمل ہے۔ کسان حکومت کی طے شدہ کم از کم قیمت بھی حاصل نہیں کر پاتے۔ بھارتی پنجاب میں گرین انقلاب کی چمک ٹھنڈی پڑ چکی ہے۔ بھارتی پنجاب میں کاشت کاری سے اوسط انکم اگر 1970ء کی دہائی میں 9.52 فیصد تھی تو یہ 1980ء کی دہائی میں تھوڑی گر کر 8.38 فیصد پر آئی مگر 90 کی دہائی میں یہ انتہائی کم ہو کر 1.21 فیصد رہ گئی۔ چاول کی کاشت جو 1980ء کی دہائی میں 3.48 فیصد سالانہ بڑھ رہی تھی 1990ء کی دہائی میں کم ہو کر 1.87 فیصد رہ گئی۔ بھارت میں زرعی سٹاک بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ سٹاک میں اس لئے اضافہ نظر آتا ہے کیونکہ فی کس کھانے کی کھپت کی شرح کم ہو گئی ہے۔ بھارت نے ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن (ڈبلیو ٹی او) معاہدے پر دستخط کئے ہوئے ہیں جس کے تحت وہ اپنی زرعی پالیسی کو ''لبرلائز'' کر رہا ہے۔ اس عمل سے بھارت میں زرعی اجناس کی درآمد 2.3 ارب ڈالر تک پہنچ گئی ہے۔ WTO کی شرائط وہ ممالک منوا رہے ہیں جو اپنے کسانوں کے بے پناہ سبسڈی دیتے ہیں۔ امریکہ اور OECD ممالک میں ایک کروڑ بڑے فارمرز کو تقریباً ایک ارب ڈالر روزانہ کی سبسڈی ملتی ہے جبکہ بھارت کے ایک کروڑ کسان خاندان ٹیکنالوجی تک رسائی نہ ہونے، زرعی اوزاروں کے بغیر، سرمائے اور اچھی مارکیٹوں کی عدم موجودگی میں روزانہ زندہ رہنے کی جدوجہد میں مصروف رہتے ہیں۔

بے روزگاری : نوکریوں کی تلاش کی صورتحال کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ جب فروری 2004ء میں بھارتی ریلوے نے 22000 نوکریوں کا اعلان کیا تو سات لاکھ چالیس ہزار افراد نے ان کے لئے درخواستیں دیں۔ کیرالہ جیسی ریاست میں ایک سکول ٹیچر کی

بھرتی کا ریٹ 5 لاکھ روپے رشوت ہوگیا ہے۔ بے روزگاروں کی سرکاری تعداد 35 ملین یعنی ساڑھے تین کروڑ افراد ہیں اور اگلے چار سالوں میں مزید دو کروڑ افراد اس میں شامل ہو جائیں گے۔ جبکہ پلاننگ کمیشن کے مطابق 24-14 سال کی عمر کے نوجوانوں کی تعداد 21 کروڑ ہے جس میں صرف 10 کروڑ کے پاس نوکریاں ہیں۔ کیرالہ میں بے روزگاری کی شرح 20.9 فیصد، ویسٹ بنگال میں 14 فیصد اور تامل ناڈو میں 11.78 فیصد رہی۔ واجپائی کے دور میں ایک اندازے کے مطابق دیہاتوں میں 43 فیصد جبکہ شہروں میں 36 فیصد لوگ بے روزگار ہیں۔

سوشل سیکٹر : بھارت اپنے کل داخلی پیداوار (GDP) کا صرف 1.1 فیصد سوشل سیکٹر پر خرچ کرتا ہے۔ واجپائی نے دعویٰ کیا تھا کہ ملک کی دس ریاستوں کے ہر گاؤں میں بجلی پہنچا دی جائے گی اور 2007ء تک بھارت کے تمام دیہاتوں میں بجلی ہوگی۔ بجلی پہنچانا تو دور کی بات، بھارت کے ایک لاکھ 60 ہزار دیہاتوں کو ابھی سڑک بھی نہیں پہنچی۔ 80 ہزار دیہاتوں میں ابھی بجلی پہنچانا باقی ہے۔ 56 سال کی آزادی کے باوجود بھارت کے 63 فیصد دیہاتی گھروں میں بجلی نہیں اور وہ روشنی کے لئے مٹی کے تیل کو جلاتے ہیں۔ بھارت کی 28 فیصد دیہاتی آبادی کو صاف پانی نہیں ملتا اور ایک ریسرچ کے مطابق کوکا کولا اور پیپسی کولا کے 12 سافٹ ڈرنک برانڈز میں کھاد (pesticide rsidues) پائی گئی۔

واجپائی گھر بنانے کی نئی نئی خوشنما سکیموں کا اعلان کرتا رہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ بھارت کی کل آبادی کا پانچواں حصہ گرتی ہوئی چھتوں کے نیچے زندگی گزار رہا ہے اور ایک تہائی آبادی کے گھروں کی دیواریں کچی ہیں۔ بھارت میں 3 کروڑ بچے سکول نہیں جا پاتے۔ بھارت تعلیم پر اپنی کل جی ڈی پی کا صرف 3.3 فیصد خرچ کرتا ہے۔ پاکستان میں یہ شرح اس سے بھی کم ہے۔ واجپائی نے اگرچہ پچھلے سال 2003ء کے دوران آئین میں ''تعلیم سب کے لئے'' ترمیم منظور کرائی مگر حقیقت یہ ہے کہ حکومت اس آئینی حق کے لئے وہ رقم مخصوص نہیں کرتی جس کی بنیاد پر تمام افراد تعلیم حاصل کر سکیں۔ واجپائی سرکار اپنے غیر ملکی ریزروز کا بڑے شور سے دعویٰ

کررہی ہے کہ اس کے پاس 100 ارب ڈالر فارن ریزروز ہیں مگر وہ یہ نہیں بتاتے کہ انہوں نے 100 ارب ڈالر قرضہ بھی واپس کرنا ہے۔

پبلک سیکٹر : واجپائی کی این ڈی اے حکومت کا بنیادی فلسفہ معیشت چلانے میں ریاست کے کردار کو کم کرنا ہے۔ ایسا کرنا غیر ترقی یافتہ ممالک کے لئے خودکشی کرنے کے مترادف ہے۔ واجپائی سرکار نے ہیلتھ سیکٹر کو پبلک سروس سے نکال کر ایک انڈسٹری کا درجہ دے دیا ہے۔ صحت پر سرکار صرف 1.1 فیصد ہی خرچ کررہی ہے۔ جبکہ ریاستوں میں اس اخراجات میں پانچ سے دس فیصد کی کمی آئی ہے۔

غربت: واجپائی سرکار یہ دعویٰ کررہی ہے کہ اس کی نیولبرل پالیسیوں کی وجہ سے غربت میں زبردست کمی آئی ہے۔ یہ وضاحت کرنا مشکل ہے کہ ایک جانب غربت ''کم'' ہورہی ہے اور دوسری جانب قحط سے اموات میں کیوں اضافہ ہورہا ہے؟ واجپائی سرکار نے غربت کو کم دکھانے کے لئے غربت ناپنے کے پیمانے تبدیل کئے اور غربت کم کرنے کے جھوٹے دعویٰ جات کئے۔ اب سرکاری سطح پر دیہاتوں میں 27.1 فیصد اور شہروں میں 23.6 فیصد غربت کا دعویٰ کیا جارہا ہے۔

قیمتیں : واجپائی سرکار کے چار سالوں 99 سے 2003ء کے درمیان بھارت کی پر چیز پاور (purchase power) قوت خرید دُگنی ہوگئی۔ مگر ان چار سالوں میں لیکٹری حصہ میں 45 فیصد اضافہ، جبکہ بنیادی ضرورتوں کے حصہ کی پر چیز میں صرف 9 فیصد اضافہ ہوا۔ اس کی امید ہی کی جارہی تھی کیونکہ واجپائی سرکار امیروں کی سرکار ہے، غریبوں کی نہیں۔ ان چار سالوں میں کاریں خریدنے والوں کی تعداد میں 41 فیصد اور دوپہیہ گاڑی خریدنے والوں میں 48 فیصد اضافہ ہوا۔ جبکہ چاول کی قیمتیں 1999ء کے 16.16 روپے فی کلو سے بڑھ کر فروری 2004ء میں 24 روپے ہوگئی۔ ڈبل روٹی چار روپے سے بڑھ کر 9 روپے ہوگئی۔ کوکونٹ آئل 43 روپے

سے بڑھ کر 91 روپے فی لیٹر تک جا پہنچا۔ نمک 2.71 روپے سے بڑھ کر 7.5 روپے ہوگیا۔ جبکہ آلو 5 روپے سے بڑھ کر 12 روپے فی کلو ہوگئے۔ مٹی کا تیل 6.74 روپے سے بڑھ کر 18 روپے فی لیٹر ہوگیا۔

کیا بھارت ایک انفارمیشن ٹیکنالوجی سپر پاور ہے؟

واجپائی سرکار نے یہ دعوی بار بار کیا کہ ہم انفارمیشن ٹیکنالوجی میں سپر پاور بن گئے ہیں۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کی ڈومیسٹک انڈسٹری بھارت کی کل جی ڈی پی کا ایک فیصد سے بھی کم ہے۔ بھارت کی سافٹ ویئر ایکسپورٹ دنیا کی سافٹ ویئر مارکیٹ میں صرف 1.5 فیصد حصہ رکھتی ہے۔ ایک آئی ٹی سروے کے مطابق بھارت دنیا کے 55 ملکوں میں 54 نمبر پر ہے۔ ہر 1000 لوگوں میں سے صرف 3 کے پاس کمپیوٹر ہے، یہاں پر کمپیوٹر کا استعمال دنیا میں استعمال کی شرح کا پانچوں حصہ بھی نہیں، انٹرنیٹ بھارت میں 0.1 فیصد افراد استعمال کرتے ہیں جبکہ مقابلتاً تائیوان میں 14 فیصد افراد انٹرنیٹ استعمال کر رہے ہیں۔ یورپ کے ہر ملک میں یہ شرح 50 فیصد سے آگے ہے۔ بھارت میں ایک کمپیوٹر پر خرچہ ایک عام فرد کی دو سال کی تنخواہ کے برابر ہے۔ بھارت کی آئی ٹی ٹراسیکشن کا 90 فیصد انگلش میں ہے جو دنیا میں صرف 5 فیصد لوگوں کی زبان ہے۔

لوک سبھا کے چودھویں انتخابات

ان انتخابات میں دو بھارت ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے ہیں۔ ایک سرمایہ داروں کا بھارت دوسرا محنت کش عوام کا۔ سرمایہ داروں کے بھارت، میں گجرات میں مسلمانوں کے وحشیانہ قتل عام کو منظم کیا جاتا ہے اور اس سے سیاسی فائدے اٹھائے جاتے ہیں۔ اس بھارت میں نوکریاں دینے کی بجائے فارن ریزروز اور اوپن مارکیٹ کی لوریاں سنائی جاتی ہیں۔ یہاں پر زرعی مزدوروں کے لئے قانون سازی کی بجائے مندر بنانے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ یہاں پر امریکہ اور برطانیہ کو عراق پر غاصبانہ قبضہ کے خلاف بات کرنے کی بجائے

بھارت میں امریکی اڈوں کی تجاویز پر بحث کی جاتی ہے۔اس بھارت میں بھگت سنگھ کو بھلانے کی باتیں ہورہی ہیں۔سوارکا(Savarka) کی عبادت کی جارہی ہے جس نے برطانیہ کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور ہندوستان کو ہندوؤں کی سلطنت اور انہیں مسلح کرنے کی چارہ جوئی کی۔یہ تمام اقدامات محنت کش عوام کے ہندوستان پر ایک مکمل جنگ کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔

چودھویں عام انتخابات میں بھارتی کمیونسٹوں نے نیشنل ڈیموکریٹک الائنس پر 10 نکاتی چارج شیٹ لگائی ہے۔

چارج نمبر 1: این ڈی اے کا سب سے زیادہ گھناؤنا جرم گجرات میں مودی کی ''پاگل''، حکومت اور قتل عام

1999ء میں جب واجپائی کی بی جے پی ایک الائنس کے ساتھ انتخابات میں اتری تو اس کے الیکشن منی فیسٹو میں ایودھیا کا کوئی ذکر نہ تھا۔لیکن اس کی حکومت کے 5 سالوں میں ایودھیا کے ایشو کو شعوری طور پر ابھارا گیا اور مندر بنانے کا عزم جاری رکھا گیا۔چنانچہ ایودھیا کے ایشو پر اکٹھا ہونے والا تعصب جب گجرات میں مسلمانوں کے قتل عام کی صورت نمودار ہوا، تو دنیا کو جرمنی میں نازیوں کے ہاتھوں یہودیوں کی قتل وغارت کے سائے یاد آ گئے۔چند گھنٹوں میں 2000 سے زائد مسلمانوں کو ہلاک کر دیا گیا۔اور کروڑوں کی جائیداد کو جلا کر خاکستر کر دیا گیا۔یہ سب کچھ ریاست کی نگرانی میں ہوا۔جب پورا ہندوستان گجرات کے وزیر اعلیٰ مودی کی برطرفی کا مطالبہ کر رہا تھا تو واجپائی حکومت نے مودی کو مکمل تحفظ دیا اور اس کی کھل کر حمایت کی۔جس طرح ایک چیل مردہ جانور کو لپک کر کھانے کو آتی ہے اسی طرح مودی حکومت نے اس قتل عام سے سیاسی فائدہ اٹھانے کے لئے وقت سے پہلے انتخابات کرانے کا اعلان کر دیا۔مگر الیکشن کمیشن نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔

موجودہ انتخابات کے موقع پر بی جے پی جو پاکستان سے بہت ''اچھے تعلقات'' کا ڈھنڈورا پیٹ رہی ہے۔گجرات کے دسمبر 2002ء کے انتخابات میں ان کی ساری انتخابی حکمت

عملی اینٹی پاکستان نعروں پر مشتمل تھی۔ اب بی جے پی گجرات کی یادوں کو بھلانا چاہتی ہے۔ گجرات میں مسلمانوں کا قتل عام واجپائی سرکار کا سب سے گھناؤنا جرم تھا۔

چارج نمبر 2: نارتھ ایسٹ میں بہن بھائیوں کو لڑانے کی سازش، بی جے پی کی ''تقسیم کرو اور حکمرانی کرو'' سیاست

اگر گجرات نے سنگھ پریوار کے فرقہ وارانہ جارحیت کا گھناؤنا چہرہ بے نقاب کیا ہے تو نارتھ ایسٹ میں مختلف قبائل کو آپس میں لڑانے کی سیاست، بی جے پی کی ''تقسیم اور حکومت کرو'' پالیسی کی آئینہ دار ہے۔ بی جے پی ان دنوں ایک فیڈرلزم کو مذہبی بنیادوں پر مضبوط کرنے کا دعوی کررہی ہے چونکہ وہ ان علاقوں میں خود اکیلے حکومت نہیں کرسکتی اور اسے الائنس کا سہارا لینا پڑتا ہے، لہٰذا وہ ایک فیڈرل کے پردے میں ایک سخت ریاست سے کام لے رہی ہے۔ بی جے پی یہاں پر قومی آزادی کی تحریکوں کو تقسیم کرنے کے ایجنڈا کو آگے بڑھا کر قبائل کے درمیان لڑائیوں کو فروغ دے رہی ہے تا کہ وہ ان علاقوں میں اپنی شاونسٹ مذہبی پالیسوں کے ایجنڈا کو مضبوط کرسکے۔

چارج نمبر 3: پوٹا (POTA) اور سخت ریاست بھارتی عوام کے لئے، خود امریکی سامراج کے آگے گھٹنوں کے بل جھکنا

این ڈی اے کی حکومت داخلی طور پر ریاستی جبر اور فرقہ ورانہ جارحیت سے کام لے رہی ہے جبکہ خارجی طور پر ہمسایوں سے نفرت کو بڑھانے اور امریکی سامراج کے آگے گھٹنوں کے بل جھکنے میں نظر آتی ہے۔ انتخابات کے موقع پر پاکستان سے دوستی کا جانچا تلانا ٹک اس حقیقت کو نہیں چھپا سکتا کہ کارگل کے بعد بھی این ڈی اے حکومت نے بھارت کو ایک اور جنگ کے کنارے لا کھڑا کیا تھا۔ 11 ستمبر 2001ء کے بعد اس نے بش انتظامیہ کی کھل کر حمایت کرنے کا اعلان کیا اور پارلیمنٹ کے ایک جائنٹ سیشن میں ظالمانہ پوٹا (POTA) بل منظور کرالیا ایک ملک کے طور پر جہاں اس نے دوسو سال ایک ظالم نوآبادیاتی دور میں گزارے ہوں وہاں اسے عراقی عوام کو محکوم

بنانے والے سامراجی ممالک کے خلاف کھڑے ہونا چاہیے، مگر واجپائی سرکار نے بے شرمی سے امریکی و برطانوی سامراج کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے صیہونی اسرائیلی حکمران طبقات سے بھی اپنے خصوصی تعلقات استوار کر لئے ہیں جو فلسطین میں روزانہ قتل وغارت کر رہا ہے۔ بش انتظامیہ ایک گلوبل ایمپائر کی تعمیر کے لئے جس جنگجو اینٹی مسلم پالیسیوں کو اختیار کر رہی ہے، وہ واجپائی سرکار کو دِل سے منظور ہے اور وہ بھی اسی طرز پر کام کر رہی ہے۔

چارج نمبر 4 : بھوک اور خوف پھیلانے والی پالیسیاں

1999ء میں واجپائی کی بی جے پی کا انتخابی نعرہ تھا کہ وہ خوف، بھوک اور کرپشن ختم کر دے گی۔ آج 2004ء میں بھوک، خوف اور کرپشن واجپائی سرکار کے تین نشان بن چکے ہیں۔ بے گناہ معصوم لوگوں کو پوٹا (POTA) کے قوانین کے تحت مقدمات میں پھنسایا جا رہا ہے۔ گجرات میں غنڈہ گردی سے انہوں نے انتخابات جیتے، اور اب گجرات کی دھمکی سے مسلمانوں کے دِلوں کو جیتنے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ دہشت گرد سنگھ پریوار کے لئے کوئی پوٹا (POTA) قوانین نہیں۔ بھارت کا ایک تہائی حصہ بھوک کا شکار ہے۔ ہر بھارتی ریاست میں قحط زدہ زون موجود ہیں۔ UN کی فوڈ اور زراعت تنظیم کے مطابق بھارت میں کم از کم 20 فیصد افراد بھوک کی وجہ سے بیماریوں کا شکار ہیں۔ اگر بھارت کے بھوکوں کو ایک علیحدہ قوم کے طور پر شمار کر لیا جائے تو یہ دنیا کی چوتھی بڑی ریاست بن جائیں گے۔ واجپائی سرکار کے دوران عوام کو فی کس خوراک کی سپلائی اس قدر کم ہے کہ اس کا موازنہ 60 کی دھائی میں فوڈ کی کمی کے دور سے کیا جا سکتا ہے مگر اس کے باوجود واجپائی سرکار کے گودام خوراک سے بھرے ہوئے ہیں اور عوام میں تقسیم نہیں ہو رہے۔

چارج نمبر 5 : کرپشن بدمعاشی کی فراوانی ، ایمان داری کے وعدہ کو کیا ہوا؟

واجپائی حکومت ایک بدمعاش اور کرپٹ حکومت کے طور پر ابھری ہے۔ کرپشن حکومت کے ہر ایک سودے اور معاہدہ کا لازمی جزو بن گئی ہے۔ این ڈی اے کے کلیدی وزیر، مشیر اور حکومتی

اہل کار ہر سطح پر کرپشن ذمہ دار نظر آتے ہیں اور ان میں براہ راست ملوث ہیں۔ اکثر اوقات ٹی وی کیمروں میں وہ رشوت لیتے پکڑے گئے۔ ان کے ایمان دار حکومت کے انتخابی وعدے ہوا میں تحلیل ہو گئے ہیں۔

چارج نمبر 6 : ڈویلپمنٹ کا ڈرامہ: بھارت ہیومن ڈویلپمنٹ انڈکس میں 127 نمبر تک گر گیا

آج بی جے پی کے پاس اتنی ہمت نہیں کہ وہ پچھلے انتخابات کی طرح خوف، بھوک اور کرپشن کو ختم کرنے کے نام پر انتخابات میں اترے۔ لہٰذا وہ عوام کو یہ باور کرانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے کہ ڈویلپمنٹ ہوئی ہے۔ ایڈوانی یہ کہتا پھر رہا ہے کہ بھارت ایک سپر پاور بننے کے تمام اجزاء پر پورا اتر رہا ہے۔ اس مقصد کے لئے بی جے پی جو پیمانہ ناپ رہی ہے وہ ہی سڑکیں، موبائیل فون اور گیس کنیکشن۔ سڑکیں پاکستان کی طرح وہ بن رہی ہیں جو یا تو بائی پاس ہیں یا پھر لیگژری گاڑیوں کے لئے۔ موبائیل فون کا انقلاب تو عالمی نوعیت کا ہے جو دنیا کے ہر ملک میں نظر آ رہا ہے۔ واجپائی سرکار عوام کی حکومت کی بجائے مارکیٹ کی حکومت، مارکیٹ کے لئے، مارکیٹ کی وجہ سے، نظر آ رہی ہے۔ مارکیٹ اور منافع ہر پالیسی کی بنیاد نظر آ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوشل سیکٹر پر اخراجات کم ہو رہے ہیں اور بھارت ہیومن ڈویلپمنٹ انڈیکس میں 124 ویں نمبر سے 127 نمبر تک نیچے گر گیا ہے۔

چارج نمبر 7 : بے روزگاری میں اضافہ، چھانٹیاں کرنے والی حکومت اور نوکریوں کی تلاش میں افراد پر گولیوں کی بوچھاڑ

چند سال قبل، واجپائی نے آزادی کے دِن پر ہر سال ایک کروڑ نوکریاں پیدا کرنے کا دعویٰ کیا یہ دعویٰ پورا نہ ہوا۔ جبکہ ملک میں 15 کروڑ بے روزگار ہیں۔ واجپائی کا ان کے لئے نوکریوں کا وعدہ صرف ایک مذاق ہی بن گیا ہے۔ نوکریوں کی تلاش میں اپنی ریاستیں چھوڑ کر دوسری جگہ جانا ایک معمول بن گیا ہے۔ جس سے فرقہ واریت میں بھی اضافہ اور فرقہ وارنہ ہنگامے ہو رہے ہیں، نوکریاں دینے کی

موجود ہر فتار سے تمام بے روزگاروں کو نوکریاں دینے میں کم از کم 250 سال درکار ہیں۔

چارج نمبر 8 : این ڈی اے کے لئے بھارت صرف ایک رئیل اسٹیٹ ہے

بی جے پی حکومت نے جو نئی اکنامک پالیسیوں کو متعارف کروایا جن میں نج کاری لبرلائزیشن، ڈی ریگولیشن اور گلوبلائزیشن شامل ہے اس کا کریڈٹ اس سے قبل کانگریس کی حکومت کو جاتا ہے۔ کانگریس کی آغاز کردہ پالیسوں پر تیزی سے عمل بی جے پی حکومت کر رہی ہے۔ دونوں پارٹیوں کا معاشی ایجنڈا ایک ہے۔ واجپائی سرکار نے معیشت کے ہر سیکٹر کو عالمی اجارہ دار کمپنیوں کو لوٹ مار کے لئے کھول دیا ہے۔ غیر ملکی ملٹی نیشنل کمپنیاں آج معیشت کے کسی بھی شعبہ میں حصص کی اکثریت خرید سکتی ہے۔ اس طرح بھارت آج بی جے پی کے لئے ایک رئیل اسٹیٹ بن کر ابھرا ہے۔

چارج نمبر 9 : صنعتوں کا بند ہونا اور زرعی بحران، ''اچھا محسوس کرو'' فیکٹر کا جڑواں تحفہ

نئی زرعی پالیسی ڈبلیو ٹی او کے معاہدہ کی روشنی میں لاگو کی گئی ہے۔ لینڈ ریفارمز کی واپسی ہو رہی ہے۔ انڈین زراعت کو کارپوریٹ فارمنگ میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ ایسا کرنے سے سب سے پہلا منفی اظہار زراعت کے موجودہ بحران سے نظر آتا ہے۔ ہزاروں کسانوں نے زرعی بحران میں خودکشیاں کر لی ہیں اور وہ قرضہ جات کے شکنجے میں بری طرح جکڑے جا چکے ہیں۔ جبکہ بے شرمی کی حد یہ ہے کہ دوسرے گرین انقلاب کی باتیں کی جا رہی ہیں۔ پہلے گرین انقلاب سے صرف وقتی بحران نہیں آیا، بلکہ یہ اس کے اپنے سب سے مضبوط علاقہ پنجاب میں تباہ کن اثرات لے کر آیا ہے۔ پنجاب اور اندھرا پردیش میں کسانوں کو خودکشیوں کی تعداد ملک میں سب سے زیادہ ہے۔ گرین انقلاب کے دوران اگرچہ فصلوں کی زرخیزی بڑھ گئی، مگر ان فصلوں کے حاصلات کو عوام میں تقسیم کرنے یا کم قیمت بیچنے کا یا دوسرے الفاظ میں ہوم مارکیٹ تعمیر کرنے کا کوئی منصوبہ نہ تھا۔ اور یہ ایک ایسے ملک میں جہاں دنیا کی سب سے زیادہ غربت پائی جاتی ہے۔ زراعت میں آج بڑے پیمانے پر پبلک انوسٹمنٹ کی ضرورت ہے۔ لینڈ ریفارمز کو مکمل کرنے کی ضرورت ہے اور غلہ

کی عوام میں مناسب تقسیم کے طریقہ کار کی۔ یہی صورتحال صنعت کی ہے، جہاں عام روایاتی صنعتیں انوسمنٹ نہ ہونے سے بند ہو چکی ہیں۔

چارج نمبر 10: سوشل سیکٹر۔امیروں کے لئے، غریبوں کو لوٹنا

واجپائی حکومت یہ کہتی رہی ہے کہ وہ معیشت ٹھیک کرنا چاہتی ہے تا کہ سوشل سیکٹر پر زیادہ توجہ دے سکے۔ نج کاری سے حاصل شدہ رقم ان شعبوں میں خرچ کی جائے گی۔ مگر مرکز کی جانب سے تعلیم، ٹرانسپورٹ اور صحت کے شعبہ جات میں اضافہ انتہائی کم ہے۔ شرح تعلیم 36.4 فیصد سے آگے نہ جا سکی ہے۔ سکول چھوڑ کر بھاگنے والوں بچوں کی تعداد 40 فیصد ہے۔ حقیقت میں حکومت تعلیم کو کمرشلائز کر رہی ہے۔ سکولوں کے نصاب میں تبدیلی، تاریخ کی کتابوں میں تبدیلی، یونیورسٹی نصاب میں نجومیت کا شعبہ شامل کرنا اور لبرل پروگریسو اکیڈیمک سٹاف کی چھانٹیاں کرنا! یہ ہے بی جے پی حکومت کا تعلیمی ایجنڈا ہے۔ یونیورسٹیاں بیچی جا رہی ہیں۔ یوں اعلیٰ تعلیم عام لوگوں کے بس سے باہر ہو جائے گی۔ ہیلتھ سیکٹر کی بھی یہی کہانی ہے۔

واجپائی حکومت پر دس نکاتی چارج شیٹ بالکل واضح کرتی ہے کہ یہ سامراجی ایجنڈا پر کام کرنے والی ایک ایسی متعصب حکومت ہے جو غنڈہ گردی، بدمعاشی اور کرپشن کے تمام ریکارڈ توڑ رہی ہے۔ بدقسمتی سے واجپائی کی این ڈی اے کے خلاف بڑی اپوزیشن کانگریس کی ہے جو اس کی معاشی پالیسیوں سے مطابقت رکھتی ہے۔ کانگریس بھی این ڈی اے طرز پر الائنس بنانے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ واجپائی حکومت کو ہر صورت ہٹانے کے نام پر دو بڑی کمیونسٹ پارٹیاں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (CPI) اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا مارکسسٹ (CPIM) کانگریس کے ساتھ اتحاد اور الائنس بنانے کی پالیسیوں پر گامزن ہیں۔ اس طرح ان کمیونسٹ پارٹیوں نے تیسری طاقت بننے کے طریقہ کار کو خیر آباد کہہ دیا ہے۔ سرمایہ داروں کے ایک دھڑے کی حمایت کی جائے یا دوسرے کی، اس میں مزدوروں کی نمائندگی کرنے والی کمیونسٹ یا سوشلسٹ پارٹیوں کو کوئی خاص فائدہ نہیں۔ بھارت کی سیاست کا تازہ ترین المیہ یہ ہے کہ ملک کی سب سے

بڑی کمیونسٹ پارٹی سی پی آئی ایم، جو بنگال میں عرصہ دراز سے حکومت کر رہی ہے، جو سی پی آئی سے 1960ء کی دھائی میں علیحدہ اس بنیاد پر ہوئی کہ وہ کانگریس کی بی ٹیم کے طور پر کام کر رہی ہے۔ اب 4 دھائیوں بعد سی پی آئی کی کانگریس سے الائنس بنانے کی پالیسیوں پر لوٹ آئی ہے۔ صرف سی پی آئی ایم ایل (CPIML) آزادنہ بنیادوں پر ان انتخابات میں محدود حلقوں سے حصہ لے رہی ہے۔ اور کسی سرمایہ دار گروہ کے ساتھ الائنس بنانے کی بجائے تینوں کمیونسٹ پارٹیوں اور دوسرے لیفٹ اور پروگریسو گروپوں کے اتحاد کی پالیسی کو سامنے لا رہی ہے۔ بھارتی انتخابات میں بی جے پی کی این ڈی اے الائنس جیتے یا کانگریس دیگر گروپوں کے ساتھ مل کر الائنس بن کر حکومت بنائے، ان کی پالیسیاں بھارت کے محنت کش عوام کے لئے کسی خوشحالی کا پیغام سامنے نہیں لا سکتیں۔ بی جے پی کی پاکستان دوستی پالیسی کا حقیقی ٹیسٹ انتخابات کے بعد ہی سامنے آئے گا۔

☆☆☆

ٹوبہ ٹیک سنگھ: جاوید انجم چل بسا

ملاؤں نے زبردستی مسلمان کرنا چاہا تھا

جدوجہد رپورٹ (مئی 2004ء)

ٹوبہ ٹیک سنگھ کے گاؤں 291 گ ب کا 19 سالہ مسیحی نوجوان 2 مئی کو فیصل آباد کے الائیڈ ہسپتال میں دم توڑ گیا۔ جاوید انجم کو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں واقع گاؤں ترانڈی چک نمبر 323 (ج ب) کے ایک مدرسہ کے مولوی غلام رسول اور ان کے ساتھیوں نے پانچ روز تک تشدد کا نشانہ بنایا اور اسے اغوا کر کے مدرسہ میں بند رکھا۔ مدرسہ کے مہتمم نے بعد ازاں جاوید انجم پر مدرسہ کی پانی والی موٹر چوری کرنے کا الزام لگا کر ٹوبہ ٹیک سنگھ میں چھوڑ دیا۔ تشدد کے نتیجہ میں جاوید انجم کی تین جگہ سے ہڈی ٹوٹ گئی تھی جبکہ اس کے گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ بی کام کے طالب علم جاوید انجم کا آبائی گاؤں 291 گ ب، تھا مگر وہ پڑھائی کے سلسلہ میں کوئٹہ بلوچستان میں رہتا تھا جہاں سے وہ ایک شادی میں شرکت کے لئے لاہور آیا تھا۔

جاوید انجم 14 اپریل کو گاؤں آیا۔ 17 اپریل کو وہ ترانڈی کے مدرسہ حسن بن مصطفٰے کے باہر پانی پی رہا تھا کہ اسے مولویوں نے پکڑ لیا اور یہ معلوم ہونے پر کہ وہ عیسائی ہے اسے مسلمان کرنے کی زبردستی کوشش کی۔ اسے بار بار کلمہ طیبہ پڑھنے پر مجبور کیا جاتا رہا۔ 5 روز تک اس پر وحشیانہ تشدد جاری رکھا گیا۔ بعد ازاں اسے ٹوبہ ٹیک سنگھ چھوڑ دیا گیا۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں اس کے والدین اور بہن بھائی اس کی گمشدگی کا اعلان کر رہے تھے۔ جاوید انجم کو فوری طور پر الائیڈ ہسپتال

شفٹ کر دیا گیا۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہیومن ڈویلپمنٹ کے فاروبونی مینڈس، عاطف جمیل پگان، بھٹہ مزدور یونین کے ایوب انجم اور لیبر پارٹی پاکستان کے طارق محمود نے فوری طور پر اخباری رپورٹروں سے رابطہ کیا اور پولیس پر زور ڈالا کہ مقدمہ درج کیا جائے۔ میڈیکل رپورٹ ہونے، جاوید انجم کے نزعی بیان ہونے کے باوجود پولس نے مقامی ملاؤں کے زیر اثر مقدمہ درج کرنے سے انکار کر دیا مقامی اخبارات نے خبر شائع کرنے سے انکار کیا۔

عاطف جمیل پگان اور یونس انجم نے بعد ازاں لیبر پارٹی پاکستان کے سیکرٹری جنرل فاروق طارق سے رابطہ کیا۔ 28 اپریل کو لاہور میں جاوید انجم کے چچا جمیل انجم اور فاروق طارق نے ایک پریس کانفرنس میں اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ ملاؤں کے خلاف فوری مقدمہ کیا جائے اور وزیر اعظم اعلیٰ پنجاب الائیڈ ہسپتال کا فوری دورہ کریں اور جاوید انجم کے مفت سرکاری علاج کا اعلان کیا جائے۔ پریس کانفرنس کو دو اخبارات ڈان اور ڈیلی ایکسپریس نے شائع کیا جبکہ ''جدوجہد'' کی اطلاعات کے مطابق یہ خبر نہ صرف آن لائن سے قومی سطح پر جاری کی گئی بلکہ ڈیلی جنگ کے رپورٹر نے بھی یہ خبر تفصیلی طور پر فائل کی مگر شائد ''حساس'' نوعیت دیکھ کر خبر کو پرنٹ کرنے سے انکار کر دیا گیا۔

ڈیلی ''ڈان'' نے پریس کانفرنس کے ساتھ مولوی غلام رسول کی تردیدی خبر زیادہ جگہ پر شائع کی۔ مولوی غلام رسول کا کہنا تھا کہ یہ نوجوان چوری کرنے آیا تھا اس لئے ہم نے اس کو پولیس کے حوالے کر دیا اور یہ کہ اس کے ورثاء کو مقامی سیاست دانوں کی حمایت حاصل نہیں۔ تردیدی بیان میں کسی جگہ اس پر تشدد کرنے کی تردید نہ کی گئی اور نہ ہی یہ بتایا گیا کہ اس کو پانچ روز تک مدرسہ میں کیوں بند رکھا گیا۔

2 مئی کو جاوید انجم فیصل آباد میں چل بسا۔ پولیس نے دفعہ 302 کے تحت مقدمہ درج کر لیا ہے۔ مولوی غلام رسول گرفتار ہے مگر اس کے ساتھی فرار ہیں۔ پولیس کی غفلت نا اہلی

اور مولویوں کو بچانے کی کوششیں فوری طور پر نوجوان کا علاج نہ کراونے کا نتیجہ جاوید انجم کی موت کی صورت میں نکلا ہے۔

لاہور پریس کانفرنس میں فاروق طارق نے کہا یہ واقعہ مذہبی جنونیت کے پھیلاؤ کا اظہار ہے۔ متحدہ مجلس عمل کی سیاست کا منطقی نتیجہ ہے اور اقلیتوں پر تشدد کے واقعات کا ایک تسلسل ہے۔

جاوید انجم کی موت پاکستان میں مذہبی اشتعال انگیزی کا ایک منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ واقع مذہبی رواداری کے خاتمے کا اظہار ہے۔ یہ جابجا کھلے ہوئے غیر قانونی مدرسوں میں پڑھائے جانے والے نصاب کے عوام پر اطلاق کا نتیجہ ہے۔ زیادہ تر مدرسوں میں تمام تر تعلیم منفی اور اقلیتوں کو کفار ثابت کرتے ہوئے ان کو ہر صورت مسلمان کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے اس کا نتیجہ ایک معصوم نوجوان کی موت کی صورت میں نکلا ہے۔

☆☆☆

اسلامی بنیاد پرستی کا ابھار

تاریخ، حقائق اور تجزیہ

297.1977
40 I
96200

جدوجہد پبلیکیشنز